

خدا وہ وقت نہ لائے

”سنو یا در! تم نے کبھی وہ کوئلہ دیکھا ہے جو بظاہر تو بیوقوف بن گیا ہو لیکن اس کے اندر ایک چنگاری سلگتی ہو۔ اس کوئلے کے اوپر سفید راکھ کا غلاف چڑھ جاتا ہے ایسا ہی ایک غلاف میرے احساسات پر چڑھ گیا ہے راکھ جیسا غلاف اور ایسی ہی ایک چنگاری میرے اندر دھکتی ہے جو کسی نہ دکھائی نہیں دیتی۔ جس کی تپش ایک میری رگ جاں کے سوائے کسی تک نہیں پہنچتی جو سستی ہے بجھتی ہے پھر سلگتی ہے جیسے کوئی اسے اپنے آنچل سے ہوا دیتا ہو۔ جیسے کوئی اسے بھڑکتے اور جلتے رہنے پر مجبور کرتا ہو۔ سنو یا در! یا تو میں ایسا مجنوںوں کا کہہ برے کو جلا کر راکھ کرنا اور کیا یہ بھول گا کہ میرا پورا وجود سفید راکھ میں تبدیل ہو جائے گا اور تمہارا دوست سکندر تمہیں نہیں نہیں ملے گا۔“

قلم اس کی سرد انگلیوں میں دبے دبے برف کے ٹکڑے جتنا خنڈا ہوا پڑھا تھا۔ یہ برف کھٹکنا ہوا خط چاروں طرف سے حمل آور ہوتی برفانی ہواؤں سے پھر پھر بار بار تھا۔ لیکن تا حال اس نے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ خط وہ مکمل کر چکا تھا۔ بس نیچے نام لکھنے باقی رہ گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ یہ لکھتے اور کیسے لکھتے۔ ”لفظ تمہارا دوست سکندر بخت۔ کتنے آسان الفاظ تھے جو اسے حق پر کرنے

تھے اور اسے یہ چند حرف لکھنا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔

”دنیا سے تو ذلیل ہوتے آئے ہیں لیکن اپنا تمسخر آپ اڑانا۔ کیا مشکل کام ہے سکندر بخت۔ واہ رکھنے والے نے کیا نام رکھا ہے ایسا نام جسے ضابطہ تحریر میں لانا عذاب ہو جائے۔ ساری دنیا ہنستی، مستحکم اڑاتی محسوس ہو۔ ماں۔ کوئی بھلا سا نام رکھا ہوتا۔ سیاہ بخت، بد بخت یا پھر کم بخت۔ کم از کم اسم باسٹھی تو ہوتے۔ یہ سکندر بخت لکھنا تو بڑا مشکل کام ٹھہرا ہے۔ بدن کا سارا خون شرم سے پانی ہو جاتا ہے اور پھر ہر گ سے یہ پانی آنکھوں کی سمیت رواں ہو جاتا ہے۔ کانوں میں ہنسی کی تمسخر سے بھر پور سیٹھوں کی اتنی آوازیں گونجتی ہیں کہ دماغ کی رگیں درد کرنے لگتی ہیں۔ پھینکنے لگتی ہیں اور اس شور میں صاف سنائی دیتا ہے سیاہ بخت، بد بخت۔ کم بخت۔“

”سکندر بھائی! آپ سوئے نہیں؟“

درد اذہ تحول کر دینے باہر آئی تھی برابر کے تختن سے آتی ملگجی روشنی میں اسے کچھ پڑھتا دیکھ کر وہ ٹھٹھکی تھی اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا، سودہ خاموش بیٹھا رہا۔

”توبہ۔ توبہ۔ کتنی سردی ہے۔“ وہ خود سے ٹکراتی ہواؤں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”مر جائیں گے سکندر بھائی! سو جائیں اب جا کر اماں نے دیکھ لیا تو دیند نصائح کا رہنما قبول لیں گی رات کے دو بجے بھی۔“

پڑ پڑ کر کئی وہ ڈوائٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس نے لکھی ہوئی تحریر کو ایک نظر دیکھا۔ بند کر کے لفافے میں رکھا اور اٹھ کر صحن سے متصل برآمدے میں آگیا جہاں ایک کونے میں اس کا بستر لگا ہوا تھا۔ صحن اور برآمدے کے درمیان جو چٹنگی ہوئی تھی وہ کافی شکستہ اور بوسیدہ تھی اور کڑکتی سردیوں میں ہوائیں بلا تکلف اندر داخل ہو جایا کرتی تھیں۔ سکندر کو سردیاں سخت ناپسند تھیں۔ سردیوں کا آغاز ہوتے ہی چچی صندوق سے اس کا وہی سال خوردہ زخمی لحاف نکلا کر چھت پر ڈالوا دیا کرتی تھیں تاکہ اس کی بو مر جائے۔ لیکن وہ بدبو اس لحاف میں کچھ یونہی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ کئی سال کی ریاضت کے بعد اسے ردی پر اس قدر رقت صرف حاصل ہوا تھا کہ وہ اس کے ریشے ریشے میں بس سکتی تھی۔ بھلا چند دن مر بھائی ہوئی، صوب میں پڑے۔ سنے سے اس بو کا کیا بگڑ سکتا تھا اور بات بحث اس بدبو کی ہی نہیں تھی۔ مات البنا

ہزار ہاشگافوں کی بھی تھی جو ایک ایک کر کے اس کہن زدہ لٹاف کے جسم پر نمودار ہو چکے تھے۔ بڑا کی برچھیاں ان شگافوں سے گھستیں اور سکندر کے بدن کو چھید ڈالنے کے برپے ہو جایا کرتیں۔ اس کی ساری رات کروٹ بدلتے، لٹاف کو ڈبل ٹریل کر کے اڑھنے اور جسم کو مکمل طور پر ڈھکنے کی کوششیں کرنے میں صرف ہوتی اور صبح اس کا عضو عضو اکڑن اور درد محسوس کرتا تھا۔ دن میں اس کے پاس پہننے کے لئے جو سوٹر تھا وہ پانچ برس قبل چچا میاں ریٹائر کر چکے تھے اور سوٹر کی اس ریٹائرمنٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ پورے طور پر سرد ہواؤں کا مقابلہ نہیں کر پاتا تھا۔ چچی نے بعد محبت دو سوٹر اسے عطا کر دیا۔

”ارے تمہارے چچا کا تو ہے دماغ خراب۔ بھلا کیا خرابی ہے اس میں۔ نہ کوئی سوراخ ہوا نہ ڈھیلا پڑا۔ چلو وہ تو ٹھہرے بڑی عمر کے، لگتی ہوگی انہیں زیادہ سردی۔ ایسا کر دیہ تم لے لو۔ میں تو کہتی ہوں یہ گرم بھی خوب ہے ذرا تھام کر دیکھو ہاتھ جلانے لگتا ہے ارے تمہارے چچا کا تو ہے دماغ خراب۔“

دماغ کی خرابی کی یہ تصدیق اس کے لئے بھی ہو سکتی تھی اگر دو سوٹر لینے سے انکار کرتا تو۔ سو اس نے خاموشی سے ان کے ہاتھ جلاتا وہ سوٹر ان سے لے لیا۔ ویسے بھی کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔ اس کا پرانا سوٹر کئی جگہوں سے ادھر چکا تھا۔ چنانچہ پچھلے پانچ برسوں سے چچی سردیاں شروع ہوتے ہی صندوق سے اس کا لٹاف اور گرم کپڑوں کے بکس سے اس کا سوٹر نکال دیا کرتی تھیں۔

ایسے میں سردیاں اسے بری نہ لگتیں تو اور کیا ہوتا۔
بستر پر لیٹ کر اس نے حسب معمول لٹاف سے کچھ جنگ لڑی اور پھر ہارے ہوئے لشکر کی طرح دم سادھ کر پڑ گیا۔

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مرجائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
آنکھیں کھول کر اس نے ہر سو بکھرے اند تیرے کودیکھا اور فنی سے مسکرا دیا۔ سرد سرد
برچھیاں ہر جانب سے حملہ آور تھیں۔

اگلی صبح وہ کار لُج جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب وہ شور میں آئی۔ "سنو سکندر! ذرا سٹاپ تک چھوڑ آؤ۔ آصف مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"چلو۔" اس نے جلدی جلدی سوٹر پہنا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"امی! میں آج ذرا دیر سے لوٹوں گی۔" باورچی خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے

اس نے ماں کو اطلاع دی۔

"بھئی! زیادہ دیر مت لگانا۔ تمہارے ابا میاں مجھ پر خفا ہوتے ہیں۔" چچی کو بیٹی کی

فراہم کردہ اطلاع ناگوار گزری۔

"عندلیب! دیر سے مت آیا کرو۔" سڑک پر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ

آہستگی سے بولا۔ "دو پہر کو یہ علاقہ بالکل سنسان ہو جایا کرتا ہے۔ اکیلی لڑکیوں کے لئے یہ جگہ خطرناک ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" وہ بے دلی سے گویا ہوئی۔

"کہاں جانا ہے جو دیر سے آنے کا کہہ رہی ہو؟" وہ اندر سے غیر مطمئن تھا۔ پھر پوچھ

بیٹھا۔

"دوست کے ساتھ جانا ہے۔" اس نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

"مجھے پتا سمجھا دو۔ میں لینے آ جاؤں گا۔"

"ریکسو سکندر! مجھے یہ چھوٹی چھوٹی باتوں چھوٹے چھوٹے واقعات پر لایعنی بحث کرنا

اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کہانا میں خود آ جاؤں گی۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔"

سٹاپ پر بس چلنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہ بات مکمل کرتے ہی چڑھ گئی۔ بہت سے

خدشے بہت سے دہم بہت سے استفسار اس کے اندر پھلتے رہ گئے بس کو دور تک جاتے اس نے

دیکھا اور پھر جیسوں میں ہاتھ ڈال کر واپس چل دیا اور اگر وہ کچھ دیر ٹھہر بھی جاتی تب بھی وہ سارے

خدشے استفسار اس کے اندر ہی رہتے۔ سوچوں کو الفاظ کا پیرا بن وہ صرف ایک ہستی کے سامنے

دیتا تھا۔ یاد رہے جو اس کا دوست نہیں اس کا ہنرا تھا۔ اپنے دل کی ہر بات کا اندھوں کو شل کرتا ہر بوجہ

وہ اس کے سامنے رکھ دیا کرتا تھا اور وہ کمال مہربانی سے پورا نہیں تو آدھا بوجہ ضرور پا کا کرتا تھا۔ ان

دنوں نے زندگی میں کئی چیزیں شینر کی تھیں۔ دکھ مال آنسو درد۔ ان کا ہر جذبہ احساس سانجھا

تھا۔ دو ماہ پیشتر اس کا داخلہ این ای ڈی میں ہو گیا تھا اور سکندر کو جتنی خوشی ہوئی تھی اتنا ہی دیکھ بھی ہوا تھا۔ خوشی دوست کا مستقبل روشن ہو جانے پر ہوئی تھی اور دیکھتا رہا کہ جانے پر۔

”مجھے خط لکھا کرنا سکندر۔ تفصیلی خط۔“ بیک کندھے پر لکائے اٹیچی کیس اٹھائے دو دور سے آتی ٹرین کو دیکھتے ہوئے جلدی جلدی بول رہا تھا۔ ”ایک ایک بات ایک ایک سوچ مجھے لفافے میں بند کر کے بھیجنا۔ تمہاری سوچوں کے بغیر میرا دماغ ادھور رہتا ہے۔“

اور سکندر اسے خط لکھتے ہوئے خود کو گلی میں بنے چبوترے پر بیٹھا ہوا محسوس کرتا۔ دو رات گئے تک اسی چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کرنے کے عادی تھے سکندر خیالوں میں اس چبوترے پر جا پہنچتا اور ایک ایک سوچ کو کاغذ پر منتقل کرتا جاتا۔

”یاور! کبھی کبھی دل میں انتہائی شدت سے وجود سے عدم میں تبدیل ہو جانے کی خواہش ابھرتی ہے تم تو سمندر کے انتہائی قریب رہتے ہو۔ کبھی ساحل پر جاؤ تو اس موج کو غور سے دیکھنا جو چپ چاپ خاموشی سے سر جھکائے آتی ہے اور تمہارے قدموں سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز تمہارے کانوں تک نہ آتی ہوگی مگر یاد رہے! ایسی موجیں بے آواز نہیں ٹوٹتیں، کبھی میرے دل تک آؤ اور ان ٹوٹتی، بکھرتی لہروں کا ماتم سنو۔ شور، محض طوفان کا خاصا نہیں۔ خاموشی بے چاری سی لہروں میں بھی ہزاروں طوفان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ تم تو میری بات سمجھتے ہو نا.....“

یاور اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ ایسا کرنے سے اسے سکندر نے ہی منع کیا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی میں نخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے ہر ہفتے وہ خود تو اسے خط بھیجتا تھا لیکن خط میں جواب نہ دینے کی تاکید بھی کر دیا کرتا تھا۔

”جب تم چھٹیوں میں آؤ تو صرف تم بولنا اور میں چپ چاپ تمہاری باتیں سنوں گا۔“

اس طرح ہمارا معاملہ بیلنس ہو جائے گا۔“

وہ اسے اکثر یہ جملہ لکھتا تھا۔ یاد رکھئے دو ماہ ہو چکے تھے اور ان دو مہینوں میں وہ محض دو بار ہی حیدر آباد آیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یاد رکھئے پر جتنی بار ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں کے دوران بھی صرف سکندر ہی بولتا رہتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس کے

پاس بولنے کے لئے بہت کچھ تھا بات دراصل یہ تھی کہ اس کے پاس اپنے دل کی باتیں کہنے کے لئے محض ایک ہی دوست تھا۔ یاد اس کا واحد سامع تھا۔ یاد کے پاس بیٹھتے ہی وہ سکندر جو عام حالات میں گونگے پن کی حد تک خاموش رہتا تھا ریڈیو کی طرح بجنا شروع کر دیتا۔ یاد اس کا سامع، غمگسار اور ناصح تھا۔

”سنو سکندر! یہ محبت جو ہے نا۔ یہ دن دے روڑ ہے۔ اس پر چلنا شروع کر دو تو یہ سوچ کر چلنا کہ اس راہ کا کوئی سرا کوئی اختتام نہیں جسے تم اپنی منزل قرار دے سکو اور یہ سوچ کر چلنا کہ ضروری نہیں دوسری جانب سے بھی کسی کے قدم تمہاری سمت اٹھ رہے ہوں۔“ وہ اسے سمجھایا کرتا تھا۔ ”دل کے منہ زور گھوڑے پر اگر ایک بار تم سوار ہو گئے تو یہ تمہیں اپنی مرضی سے چلائے گا۔ پھر خواہ تم دشت کے صحراؤں میں جانکویا نا کامیوں کے سمندر میں ڈوب جاؤ۔ یہ منہ زور گھوڑا اپنی لگا میں کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔“

اور وہ سوچتا۔ یاد ٹھیک کہتا تھا۔ یہ ابلق بے لگام شاید اسے دشت کے صحراؤں کی جانب اڑائے لئے جارہا تھا وہ خود کو بے بس، اچار محسوس کرنے لگا تھا۔ جس وادی پر خار میں قدم رکھنے سے اسے یاد نے منع کیا تھا۔ وہ اسی وادی میں داخل بھی ہو چکا تھا اور پاؤں زخمی کئے کسی نخل سایہ دار کی تلاش میں بھی تھا۔

”میں اسے اتنا چاہنے لگا ہوں یاد! کہ میری اپنی زندگی میری نگاہ میں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ اس دنیا میں سود و بیاج پر کتنے سودے ہوتے ہیں نا۔ کیا کوئی میری زندگی رہن رکھ کر مجھے میری سن پسند خوشیاں نہیں دے سکتا؟“

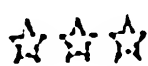
یاد نے اس کی بات سن کر اپنا سر تھام لیا تھا۔

”میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا سکندر۔“

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا!

اور یاد اسے دیکھ کر بے چارگی سے مسکرا دیا تھا۔



زندگی اس کے لئے محرومی کا دوسرا نام تھا اور اس کی محرومیوں کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی

بب اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر جو گھرا سے اپنے ارد گرد نظر آیا تھا وہ چچا میاں کا تھا۔ چچا میاں کی شادی کو بارہ برس گزر چکے تھے اور بے اولادی نے انہیں سکندر بخت کو اپنے بڑے بھائی سے مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکندر کی ماں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی کسی موزی بیماری کا شکار ہو کر مر گئی تھی۔ اس سے بڑے پانچ بھائی پہلے ہی باپ کے کاندھوں کا بوجھ تھے۔ ان کی پڑھائی، دوادار و اور دیگر اخراجات ہی کچھ کم نہیں تھے لہذا اس نے سکندر بخت کو بخوش پیوٹے بھائی اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی وہ کوئی غیر نہیں تھے ان کے درمیان خون کا 'محبت کا بڑا گہرا رشتہ تھا اور اس رشتے نے سکندر کے باپ کو بھائی اور بھادج پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لینے کا حوصلہ بخش دیا تھا۔ سکندر چچا میاں کے ساتھ حیدر آباد آ گیا۔ تین سال تک ان دونوں نے درحقیقت اسے ماں اور باپ بن کر پالا۔ اسے اکلوتی اولاد جیسی محبت دی گئی لیکن سکندر اس گھر میں تنہا نہیں آیا تھا۔ اپنے نام کے تمام تر اثرات اس وقت اس کے ساتھ تھے 'تین سال بعد چچی کی گود بری ہو گئی اور عندلیب احمد اس کی محبتوں میں حصہ دار بن کر چلی آئی۔ پھر داصف 'حسنہ' شہناز اور آصف یکے بعد دیگرے محبتوں میں شراکت دار بن کر آتے چلے گئے اور آخر کار سکندر بخت کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ نہ وہ پہلا سا بخت نہ وہ پہلی سی محبتیں۔ چچی نے جو کچھ دیا تھا۔ وہ سب واپس لے کر اپنی سگی اولادوں میں تقسیم کر دیا اور چچا میاں گھبرا کر جو غم روزگار میں گم ہوئے تو انہیں پلٹ کر کسی کو ایک نظر دیکھ لینے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ وہ نظر انداز ہو گیا اور پھر اسے نظر انداز ہوتے رہنے کی عادت پڑ گئی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلانے اور رردش مستقبل دینے کی باتیں کرنے والے چچا میاں نے چپ چاپ سرکاری سکول میں ڈال دیا لیکن یہاں وہ کچھ شکایت کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے اپنے سگے بھائی بھی دوسرے شہر میں سرکاری سکولوں میں ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن بات صرف سرکاری سکولوں پرانی کتابوں اور دوسری محدود ضروریات زندگی کی ہی نہیں تھی اس کے بعد پھر یوں ہوا کہ اسے گھر کے زائد کاموں کو نبھانے والا نہ کر سمجھ لیا گیا اور اس میں اصل اور بنیادی غلطی یا کوتاہی چچی کی تھی۔ ان کے نکالے ہوئے انداز کو اس گھر کا دستور سمجھ لیا گیا۔ وہ سکول سے آتا تو باہر کے کاموں کی ایک طویل لسٹ اس کی منتظر ہوتی۔

”سکندر! یہ لا دو۔ سکندر وہ لا دو۔ ارے میری عقل پہ خدا کی مارت ہی منگو انا تو بھول ہی گئی۔ جانے ذرا دوڑ کر لے آ.....“

وہ بازار کے چکر لگا لگا کر ہکان ہو جاتا۔ پھر چچامیاں دکان سے لوٹتے اور ان کے کاموں کا آغاز ہو جاتا۔ وہ جو اشیائے خوردنی کے چکروں سے فارغ ہو کر بیٹھا ہوتا پان اور سگریٹ لانے کے لئے گھن چکر بن جاتا۔ شروع شروع میں یہ بات اس کے لئے اتنی تشویش کا یا الجھن کا باعث ہر گز نہیں تھی لیکن پھر اس نے دیکھا داصف بھی اس قدر قابل تو ضرور تھا کہ اگر وہ وہ مرتبہ بازار سے ہو آیا ہے تو تیسری مرتبہ وہ چلا جائے لیکن تیسری تو کیا چوتھی اور پانچویں مرتبہ بھی اسے ہی پکارا جاتا۔ یہ وہ پہلا مقام تھا جہاں اس نے اس گھر میں اپنا اور داصف کا فرق جاننا چاہا اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ گھر وہاں باپ وہ بہن بھائی جنہیں وہ اب تک اپنا سمجھتا آیا تھا۔ وہ درحقیقت داصف کے ہی تھے اور وہ خود چچامیاں کی جلد بازی میں کی گئی غلطی تھی۔ تب اس نے خود میں محصور ہونا سیکھا۔ اپنے درد اپنی سوچوں کو خود تک محدود رکھنا سیکھا اور آہستہ آہستہ وہ ان سب سے الگ ہونا چلا گیا۔ اسے علم بھی نہ ہو سکا کہ کب وہ آصف کے سمجھ دار ہو جانے پر داصف کے کمرے سے نکالا گیا کب اس کا پلنگ پہلے ڈرائنگ روم اور پھر برآمدے میں لاڈالا گیا۔ کب اس کے پڑھنے کی میز مچن میں اس طرح لگائی گئی کہ وہاں زیادہ دھوپ وغیرہ نہ آئے اور وہ کم از کم شام کو وہاں بیٹھ کر پڑھ سکے۔ اسے کسی بات کا بھی علم نہ ہوا اور وہ مکمل طور پر ان لوگوں سے الگ ہو گیا۔ پھر اسے یاد ملا۔ وہ بھی اپنی ماں کے فوت ہونے پر اپنی مانی کے پاس آ کر رہنے لگا تھا اور اس کی مانی کا گھر چچامیاں کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ دونوں کاسکول اور کلاس بھی ایک تھی اسی لئے بہت جلد دونوں میں دانت کاٹنے کی دوستی ہو گئی۔ یاد کو شروع شروع میں سوال کرنے کی بہت عادت تھی اور اسی عادت نے سکند کو بہت سی باتوں کا احساس دلایا تھا۔ ان باتوں کا ادراک بخشا تھا۔ جن کی اسے خبر ہی نہیں تھا۔

اس نے پوچھا تھا۔

”تم تو انہیں چچامیاں کہتے ہو۔ کیا یہ تمہارے سکے چچا ہیں؟“

”ہاں بالکل سکے۔ میرے ابا کے چچو نے بھائی۔“

”پھر یہ تمہارے ساتھ نوکروں کا سا برتاؤ کیوں کرتے ہیں؟ داصف بھی تو ان کا بیٹا

ہے۔ سارے کام یہ لوگ تم سے ہی کیوں کر داتے ہیں؟“

وہ خاموش ہو کر سوچنے پر مجبور ہوا تھا اور پھر کئی دنوں تک سوچتا رہا تھا۔ یاد نے ایک

دن اس سے پوچھا تھا۔

”یار..... تمہارا پلنگ باہر برآمدے میں کیوں ہے؟ تم وامف اور آenf کے کمرے میں کیوں نہیں شیر کرتے؟“

”ان کا کمرہ اچھوٹا ہے۔ دو آدمیوں کے لئے ہی مناسب ہے۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”تب بھی تمہیں اس کمرے میں ہونا چاہئے۔ تم ان دونوں سے بڑے ہو۔ علیحدہ کمرے کی زیادہ ضرورت تمہیں ہے۔“

”کبھی تم اپنے گھر گئے ہو اپنے ابا کے گھر؟“ ایک بار اس نے پوچھا۔

”ہاں گیا تھا ایک سال کے لئے۔ ابا ایک دن مجھ سے ملنے یہاں آئے تو میں سردی میں اکیلا صحن میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا۔ باقی سب لوگ اندر کمروں میں تھے۔ ابا مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر ابا کا نہیں رہا وہ میرے بھائیوں میں بٹ گیا ہے۔ بڑے دو بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے کمروں کو اپنا علیحدہ علیحدہ گھر بنا چکے ہیں۔ ان کا جینا مرنا غمی خوشی ان کے کمروں تک محدود ہو گئی ہے۔ باقی تین بھائی بھی اپنی اپنی زندگی میں گم ہیں۔ میرا جو دان میں سے کسی کے لئے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں وہاں رہوں یا نہ رہوں ان میں سے کسی کو بھی اس بات سے غرض نہیں اور پھر وہ پانچوں تو بچپن سے ساتھ پلے بڑھے۔ جب ان میں آپس میں محبت اور اتفاق نہیں ہے تو مجھے وہاں کون خاطر میں لاتا؟ میں تقریباً ایک سال وہاں رہا۔ پھر ایک دن چچا میاں آئے اور ابا سے معافی تلانی کر کے مجھے واپس یہاں لے آئے۔“

”کیوں؟“

”ان کے گھر کے کام رک گئے ہوں گے۔“ یاد نے دھوکے سے کہا۔

اور سکندر سر جھکا کر ہنس دیا۔

یاد نے اسے اپنا سمجھا اس کا دکھ درد بانٹا۔ اس کی محرمیوں کو شیر کیا۔ اسے جینے کا حوصلہ دیا۔ وہ یاد کو دوست ہی نہیں محسن ماننا تھا۔ وہ اسے آئینہ میں زندگی کا چہرہ بھی دکھاتا تھا اور پھر اس کی بد صورتی سے لڑنے کا حوصلہ بھی دیتا تھا۔

کالج کے زمانے میں سکندر کے پاس اکثر ٹیوشن کے لئے فیس نہیں ہوتی تھی۔

”ارے بھئی! رکھا ہی کیا ہے ان ٹیوشن میں.....“ چچی کہتیں۔ ”وہی سب کچھ تو کالج میں بھی بتاتے ہیں۔ ذرا کوئی دھیان دے کر پڑھتے تو ٹیوشن کی بھلا کیا ضرورت۔ میں تو کہتی ہوں سکندر بیٹا! فضول خرچی ہے یہ ٹیوشن دیوشن۔ تم تو گھر میں پڑھا کرو۔ یہ برابر کی گلی میں کباڑی رہتا ہے۔ ایسی اچھی اچھی کتابیں ملتی ہیں اس کے پاس۔ تم اسی سے لے آیا کرو۔ ارے آج کل تو بندہ کتابیں خریدے یا پیٹ بھر کر روٹی کھائے۔ اے ہاں۔“ یاز نے کئی بار اس کی فیس بھری۔

ان کے محلے میں ہیلتھ کلب قائم کیا گیا۔ محلے کے سارے لڑکے باقاعدگی سے وہاں جانے لگے سکندر کے دل میں زندگی میں شاید پہلی بار کسی خواہش نے جنم لیا تھا۔ بڑی خواہش تھی اسے مضبوط کسرتی بدن کی۔ چوڑے چکے سینے اور بازوؤں میں ابھرتی مچھلیوں کا تصور اسے بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ ہیلتھ کلب کی فیس برائے نام تھی۔ لیکن چچا میاں نے اسے نکا سا جواب دے دیا تھا۔

”ارے بھائی! میری کپڑوں کی چھوٹی سی دکان ہے کاشن مل نہیں ہے میں دو وقت کی روٹی مشکل سے کما رہا ہوں تمہیں فضولیات سوچتی رہتی ہیں جاؤ پڑھو جا کر۔“

یاد رہے اس کے کام آیا۔ وہ اپنی بھی فیس بھرتا اور اس کی بھی۔ یاد رکھا باپ اسے ہر ماہ معقول رقم بھیجتا تھا۔

وہ دونوں ہیلتھ کلب باقاعدگی سے جانے لگے اور چند ہی مہینوں میں اس کا بدن شاندار ہو گیا۔ شکل و صورت بھلی تھی ہی وہ ہالی وڈ کی فلموں کا ہیرو لگنے لگا لیکن تعجب اسے اس وقت ہوا جب چچا میاں نے واصف اور آصف کو بھی ہیلتھ کلب جانے کی تلقین کرتے ہوئے فیس تہمائی۔

”دیکھو ذرا اپنے سکندر نے کیسا بدن بنا لیا ہے۔“ وہ خوش ہو کر چچی سے بھی کہہ رہے تھے اس کا دل خوش ہونے کے بجائے اندھیروں میں اترتا چلا گیا۔ اس کے شوق کو فضولیات قرار دینے والے چچا میاں نے اسی شوق کو اپنے بیٹوں کی ضروریات میں سے سمجھا۔ وہ کافی دن گم سم سا رہا۔ اسے قدم قدم پر احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ وہ اس گھر کا فرد نہیں تھا۔ وہ باہر کا شخص تھا اور یہی وہ احساس تھا جس کی وجہ سے نہ وہ چچا میاں اور چچی کو اپنے ماں باپ کے مقام پر دیکھ سکا اور نہ ان کی اولادوں میں بہن بھائیوں کی محبت ڈھونڈ سکا۔ اس کے لئے زندگی

میں ایک شناخت تھی جس کے ایک سرے پر وہ تھا اور دوسرے سرے پر اس کی قیامتیں اور تیرے سرے پر یادیں بن جانے کب کہاں اور کیسے اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی زندگی کی شناخت سے مستقبل کی صورت اختیار کر رہی ہے، کہیں خود بخود ایک سراپا اجڑنے کا اپنے وجود کا احساس والا رہا تھا اور پھر وہ سراپوری طرح ابھر کر اس کے سامنے چلا آیا۔ اس سرے پر وہ عندلیب حجازی تھی۔ اپنی تمام تر رعنائیوں اور تمنائیت کے ساتھ۔ سکندر کے لئے زندگی کا محض اور سراپا ہو گیا۔ باقی قیادوں سرے کہیں پس منظر میں چلے گئے۔ زندگی نے ایک سیدھی طویل راہ کی صورت اختیار کر لی اور اس طویل راہ پر دکھ ہی دکھ خارجی خارجے تھے۔ وہ ہمیشہ یاد کی بات مان لیا کرتا تھا لیکن یہاں یاد بھی اس کے کسی کام نہ آیا۔ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنی پری تمثال کزن کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کالج سے لوٹا تو گھر میں کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں اس کے پلنگ سے ذرا فاصلے پر بچے تخت پر چچی لیٹی بے خبر سو رہی تھیں۔ اس نے کوفت کے عالم میں کتابیں رکھیں اور گھر میں کسی کے موجود نہ ہونے کا سبب سوچنے لگا۔ سنہ اسے کالج سے واپسی پر کھانا نکال کر دیتی تھی اور اس وقت وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور باورچی خانے میں چلا آیا۔ آستریں قل ہو اللہ کا ورد کر رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے پیلے دیکھ لئے۔ سالن کا کہیں کوئی نام و نشان نہ تھا۔ مایوس ہو کر باہر نکل آیا۔ صحن میں بنے بنے پر چھت سے پہلے چھبنا سا سنہور نما کمرابنا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے کچھ کھسر پھسر کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ سیر حیاں بچھا گیا وہاں پہنچ گیا۔ اندر عندلیب تھی۔ کالج سے واپس آ کر اس نے یونیفارم بھی تبدیل نہ کیا تھا۔ سفید شلوار پر چیک کی میردن قمیض پہنے سارے بال چہرے پر بکھرائے وہ انتہائی ثنویت سے جوتھ رہی تھی۔ گندے فرش پر آرام سے بیٹھی ہوئی وہ لڑکی اسے عندلیب نہیں کوئی اور لڑکی لگی۔ عندلیب جسکی نفاست پسند اور تکسک سے رہنے والی لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔

”عندلیب!“

”آں ہاں!“ وہ بری طرح سے چونکی اور لاشعوری طور پر کانڈا لپٹی پشت کے

پیشہ آیا۔

”یہاں..... اس قدر ٹھن اور گندگی میں بیٹھی کیا لکھ رہی ہو؟“ وہ سخت حیران تھا۔
 ”کچھ نہیں..... میں وہ.....“ وہ ہٹکا کر رہ گئی۔ ”میں یہاں کچھ پرانی کتابیں ڈھونڈ رہی تھی۔ انہیں بکسوں میں رکھی تھیں میں نے۔“

”اچھا.....“ وہ ہنوز حالت تعجب میں تھا۔ ”سنہ شہناز آصف کہاں ہیں یہ سب لوگ؟“

”سنہ اور شہناز اپنی دوست کے گھر گئی ہیں۔ میلا د شریف میں۔ آصف شاید بازار گیا ہے کچھ خریدنے۔“

اس کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس کے وہاں کھڑے رہنے سے کوفت محسوس کر رہی تھی۔

”مجھے کھانا چاہیے.....“ اس نے اصل بات بیان کی۔

”کھانا..... وہ دراصل اماں کی طبیعت خراب تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں پکایا۔ رات کا سالن پڑا تھا۔ میں نے اور آصف نے وہ کھالیا۔“

”پھر.....؟“ وہ حیران تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بھوکا پیاسا کالج سے لوٹا تھا۔ کتنے آرام سے وہ سالن نہ ہونے کی وضاحت کر رہی تھی۔

”پھر.....“ وہ بیزاری سے پہلو بدل کر بولی۔ ”انڈے لے آؤ اور تل کر کھا لو۔ میں ذرا مصروف ہوں پلیز.....“

اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی اس سے اس قدر بے زار اتنی نالاں کیوں رہتی تھی اور اس کے یہ تو قطعاً سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس لڑکی میں ایسا کیا تھا جو اسے متناہی بن کر کشش کرتا تھا۔ اس کے خیالات احساسات برقی رو کی طرح اس بے مہر کی جانب کیوں بہتے تھے بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے قطعاً باہر تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ بیگانگی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی گویا وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ وہ مڑا اور ایک ایک میز پر اترتا نیچے آ گیا۔ چند لمحوں قبل تک پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور اب اس کی بھوک قطعاً مرچکی تھی اس گھر میں کون اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا تھا۔ کون اس سے عزت سے پیش آتا تھا اور کون نہیں۔ اسے اس بات کا نہ احساس تھا نہ پرواہ لیکن جب عندلیب اس

مرح سے پیش آتی تو وہ خود کو بے حد مضطرب بے حد پڑ مردہ محسوس کرتا تھا۔ ایسے میں اسے یاد رٹوٹ کر یاد آیا کرتا۔

بغیر کچھ کھائے پئے وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچتے، کڑختے نجانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔



یادو! تم وہ مہربان ہو جو دنیا کی ہر بے مہری پر ٹوٹ کر یاد آتے ہو۔ اس وقت رات کے دو بجے کا عمل ہے ساری دنیا گرم لجانوں میں لپٹی سپنوں کے نرم و نازک تار بن رہی ہے اور میں خون جماتی سخت سردی میں آنگن میں بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

یادو! جب تم یہاں آؤ تو مجھے یہ بتانا کہ اس دنیا میں کسی شخص کی محبتوں کے جواب میں محبت نہ سہی، محض ذرا سی مردت دینے سے بھی لوگ کیوں کتراتے ہیں؟ یادو مجھے بتانا کہ کسی کی ذرا سی توجہ، ذرا سی مسکراہٹ حاصل کرنے کے لئے کون سے پل صراط طے کرنے ہوتے ہیں؟

تم جانتے ہو یادو! تم نے اسے دیکھا ہے، تم اس سے ملے ہو، تم نے اس سے باتیں کی ہیں۔ مجھے بتاؤ نا یادو اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے جو مجھ سا عام شخص اس سے بات کرنے، اسے مخاطب کرنے تک کا حق نہیں رکھتا۔ مجھے بتاؤ نا کہ میری صورت، میرے جسم، میری سیرت، میری عادت میں کہاں وہ کون سی برائی ہے جو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ماتھے پر تیوری پڑ جاتی ہے۔

یادو! مجھے بتاؤ، مجھے سمجھاؤ در نہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کچھ بھی نہیں، لیکن مجھے وہ نہ ملی تو یہ ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔ ہر چند کہ وہ میری نہیں ہے لیکن میں اسے پائے بغیر بھی اے کھونے کا تصور نہیں کر سکتا۔ عجب شے ہے یہ عشق بھی، انسان کو اس کا بنادیتا ہے جو انسان کا اپنا نہیں ہوتا۔

خت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب، عشق اختیار کیا !!!

تمہارا دوست

سکندر

اس کا بی کام پارٹ دن کا رزلٹ آیا تھا اور وہ سارے پیپرز کلیئر کر گیا تھا۔ اس کے
مارکس بھی اچھے خانے تھے۔ بغیر کتابوں، بغیر کبھی ٹیوشن اور بغیر کسی کی مدد کے اس نے جس طرح
سے تھرڈ ایئر گزارا اتحادہ اس کا دل جانتا تھا۔ نوٹس بورڈ پر آدیز اس شیٹ دیکھ کر اس کا دل بلیوں
اچھلنے لگا تھا۔

کالج سے گھرنے کا فاصلہ اس نے گویا ہواؤں میں اڑتے ہوئے طے کیا۔ تیز تیز قدم
اٹھا تا وہ دروازے پر لڑکا پردہ ہٹا کر اندر گھسا اور سامنے سے آتی عندلیب سے ٹکرا گیا۔ دونوں کے
ہاتھوں سے کتابیں گر کر فرش پر بکھر گئیں۔

”معاف کرنا عندلیب! میں خوشی میں بغیر دیکھے بھاگے چلا آ رہا تھا۔“

دونوں بیٹھ کر اپنی کتابیں اٹھانے لگے تو وہ خوش دلی سے بولا۔ وہ خاموشی سے اپنی
کتابیں اکٹھی کرتی رہی۔ سکندر نے ایک نگاہ اس کے تنے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اس کا دل یک
بارگی بجھ گیا۔ اس نے جان بوجھ کر تو یہ حرکت نہیں کی تھی۔

”سنو عندلیب!“

دونوں کھڑے ہوئے تو اس نے پھر اسے آواز دے ڈالی۔

”کہو۔“ وہ پہزاری سے مڑی۔

”میرا رزلٹ اُگیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں نے سارے پیپرز کلیئر کر لئے ہیں۔“

”مبارک ہو۔“ رکھائی سے کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی آنکھوں کے گوشے غم محسوس

ہوئے۔ پہلی بار اس کے حلق میں کڑواہٹیں اتریں اسے شدت سے اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا۔
کتنی بڑی خوشی تھی یہ اس کے لئے۔ اس کا جی چاہتا تھا ایک ایک شخص کو پکڑ پکڑ کر بتائے اور سب
سے پہنا سب سے اہم ہستی نے جو رسپانس دیا تھا اس نے اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ

بدلے ہوئے چلتا اندر آ گیا۔ چچی جان تخت پر بیٹھی پالک صاف کر رہی تھیں۔
 ”السلام علیکم چچی!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”جیتے رہو!“

”چچی! میرا زلٹ آ گیا ہے‘ میں پاس ہو گیا ہوں۔“

”چلو خیر کی خدا نے!“ وہ اطمینان سے اپنے کام میں مشغول رہیں۔ ”اب اگلی

جماعت میں جاؤ گے۔“

”جی!“ وہ اٹھ کر اندر آ گیا۔

حسنہ اور شہناز بیٹھی لڈو کھیل رہی تھیں۔

”السلام علیکم سکندر بھائی!“ دونوں باجماعت بولیں۔

”وعلیکم السلام!“

وہ تھوڑی دیر بیٹھا نہیں تکتا رہا۔

”حسنہ شہناز میرا زلٹ آ گیا ہے۔ میں پاس ہو گیا ہوں۔“ نجانے کس موہومی

خواہش کے پیش نظر وہ بول پڑا تھا۔

”سچ بھائی!“ دونوں معصوم بچیاں خوش ہو گئیں۔ ”منٹھائی کھلائیں۔ نہیں نہیں آئیں

کریم کھلائیں۔“

دونوں لڈو چھوڑ چھاڑ کر اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔ اس کے اندر پہلی پھوار پڑی۔

جالتے چکتے دل کے لئے محبتیں کسی بھی صورت میں ٹھنڈا مرہم‘ نرم پھوار ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے

جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کاواکانوٹ نکالا۔ یہ اس کا اگلے پورے ہفتے کا کھانچ جانے کا کرایہ تھا۔

”یہ لو! میرے پاس بس یہی پیسے ہیں۔ جو مل سکے ان پیسوں میں دہی کھا لینا۔“ وہ

خفت سے ہنسا۔

”تھینک یو سکندر بھائی۔“ حسنہ نے دس کانوٹ اس کے ہاتھ سے جمپٹ لیا اور دونوں

کھٹکھٹاتی ہوئی باہر کی جانب بھاگ گئیں۔

وہ وہیں بیٹھا انسان کی حقیقت پر غور کرتا رہا۔ ردیوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

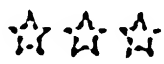
سوچتا رہا کہ کتنی خواہش تھی اس کی۔ کوئی اس کے سر پر دست شفقت پھیرتا کسی کے نرم لب اثر،

کے ماتھے کو بوسہ دیتے، اسے آئندہ زندگی میں کامیابیاں حاصل کرتے رہنے کی دعائیں دیتے۔ کسی کے نرم حنائی ہاتھ اس کے لئے دعائیں مانگنے کے لئے اٹھا کرتے، زندگی کی کوئی خوشی تو اس کی اپنی ہوتی، کوئی ایک شخص تو کسی طور پر اس سے وابستہ ہوتا۔

وہ وہیں لیٹے لیٹے سو گیا۔ کسی کو اس کے لئے کھانا لانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ خوابوں میں خود کو نجانے کیا کیا کھاتے دیکھتا رہا۔ نجانے کس کے ہمراہ پھرتا رہا۔

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے

جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں



شام کو چچامیاں آئے تو وہ سلام کر کے ان کے پاس آ بیٹھا۔

”اور سناؤ پڑحالی کیسی جا رہی ہے۔“ وہ ہمیشہ اس سے گفتگو کی ابتدا، یونہی کیا کرتے

تھے۔

— ”جی چچامیاں! خدا کا فضل ہے۔ آج میرا زلٹ آ گیا ہے۔ اچھے مار کس آئے ہیں میرے۔“

”ہوں!“ انہوں نے متانت سے سر ہلایا۔

ایک ان کا رد عمل دیکھنا ہی باقی رہ گیا تھا۔ سو اس نے دیکھ لیا۔

”چچامیاں! فائل کے لئے فیس جمع کروانی ہے۔“ وہ دبی زبان سے بولا۔ وہ کچھ دیر

کے لئے خاموش ہو گئے۔

”ایک ہفتے کا دلت ملا ہے! اگلے اتوار کو اسٹڈنٹ ہے۔“

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اپنے باپ کو اور اس کی لا تعلقی اور بے حسی کو یاد کیا کرتا تھا۔

”کتنی فیس ہے؟“

”آٹھ سو روپے۔“ اس نے سر جھکا کر بتایا۔

”نہ بھئی نہ۔“ وہ یکدم بھڑک اٹھے۔ ”میں کہاں سے اتنا خرچہ اٹھاؤں۔ تمہارے جتنے

لڑکے تو نوکریاں کر کے ماں باپ کا بوجھ ہا کا کیا کرتے ہیں اور تمہاری پڑھائیاں پوری نہیں ہو رہی

ہیں۔ تمہیں چاہئے کہ ٹیوشن پڑھاؤ اور اپنا خرچہ اٹھاؤ لیکن میاں شاید تم چچا کو باپ کی جگہ ہی نہیں

رے پائے۔ تم سوچتے ہو؟ کا ہے کو اپنا خون بوڑھے چچا کے لئے جلاؤ۔ مفت کی جب تک ملے کام
پلتا رہے۔ بیٹا اب عمر یہ آگئی ہے کہ خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھاؤ۔ تمہاری تو میں فیسیں بھر بھر کر
جنگ آگیا ہوں۔“

وہ اٹھے اور سپر کرتے آستینیں چرھاتے دھوکے لئے چوکی پر جا بیٹھے۔ وہ اپنی جگہ دم
بخود بیٹھا رہ گیا۔ آج جو کچھ چچا میاں نے اسے کہا تھا اس نے سکندر کا سارا خون اس کی رگوں میں
جلا ڈالا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انہوں نے کن فیسوں کا ذکر کیا تھا؟ اسے یاد تھا اس کی
میزک کی فیس جس وقت بھری جا رہی تھی چچا سخت بیمار پڑے ہوئے تھے اور اس کی کسی طور فیس
مانگنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ یاد رہے اپنے باپ کو خط لکھ کر پیسے منگوائے تھے اور اس کی فیس بھری
تھی۔ سرکاری سکول اور سرکاری کالج میں ہر مہینے برائے نام فیس بھری جاتی تھی۔ کتابیں تو وہ سدا
دوسروں سے مانگ کر پڑھتا رہا تھا۔ تھوڑی بہت جو پاکٹ منی ملتی تھی اسے بچا بچا کر رکھتا اور
ضرورت پڑنے پر کاپیاں اور رجسٹر وغیرہ خرید لیا کرتا تھا۔ ایسے میں جب اسے چچا میاں نے یہ
ملنے دیا تو وہ بہت دیر تک کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا پھر وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر
کی جانب چل دیا۔ باورچی خانے میں چچی غایت درجے کی بے نیازی سے روٹیاں پکا رہی تھیں۔
سکندر کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے کچھ خیال گزرا۔

”شاید چچی کی وجہ سے۔“

پھر اس نے سر جھٹکا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ پلنگ پر سیدھا لیٹا چھت کی جانب دیکھ رہا تھا پے در پے
بہت سی باتیں ایسی ہوئی تھیں کہ اب وہ اس گھر میں اپنا مقام اور اس گھر کے لوگوں سے اپنے رشتے
اور اس کی حدود کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اس گھر میں کیوں لایا گیا تھا۔ اس سے
اسے کچھ سروکار نہ تھا لیکن وہ اس گھر میں کیوں رہتا تھا اسے یہ سوچنا تھا۔

اندر کی جانب سے برآمدے میں کھانے والے دروازے کی بلکی سی چرچاہٹ اس نے
کن پھراستے ایک ہیولی ساد کھائی دیا۔

”سکندر!“

”جی چچامیاں!“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”یہ تمہاری فیس کے پیسے ہیں، کل جمع کروا دینا۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے اور مڑ گئے۔

”چچامیاں“ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

نوٹ اس کے ٹھنڈے برف ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے اور اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ وہ بچپن سے اس گھر میں تھا اسے یہاں بیٹا بنا کر لایا گیا تھا۔ پھر وہ اتنا بے قیمت اتنا بے سول کیسے ہو گیا تھا کہ اس کی فیس کے پیسے چچامیاں کو چھپ کر دینے پڑے۔

آصف اور داصف کی طرح وہ کیوں اپنی فیس لڑ جھگڑ کر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بیٹا بنا کر لانے والوں نے اسے نوکر کب بنا ڈالا تھا۔ اسے انمول سمجھ کر حاصل کرنے والوں نے اسے بے سول کب قرار دے دیا تھا۔ یہ سارے فیصلے اندر ہی اندر کب ہوئے تھے؟ اور اگر ہو چکے تھے تو پھر سکندر کو بھی کچھ فیصلے کرنے تھے۔

ساری رات جاگ کر کر دٹیں بدل کر اس نے بھی ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر سپیدہ سحر نمودار ہوتے وقت سو گیا۔



وہ سو کر اٹھا تو چچا ناشتہ کر کے دکان جا چکے تھے۔ اس نے ہاتھ منہ دھو کر پہلا کام یہ کیا کہ ان کے دیئے ہوئے پیسے ان کی الماری میں سامنے ہی رکھ دیئے۔ پھر وہ ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکل گیا۔ اسے ایک ضروری شخص سے ملنا تھا۔

”امیس بھائی! آپ سے ذرا ایک کام تھا!“

انیس بھائی ہیلتھ کلب کے نگران تھے۔ کسی زمانے میں پہلوانی کرتے تھے۔ ایک سیاسی تنظیم سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ محلے میں سب ان کے اثر و رسوخ سے واقف تھے۔

”اوہ! آؤ میری جان! یہ آج ہمارا چاند صبح کے وقت کیسے نکل آیا ہے؟“ انہوں نے اس کے کانہ سے پر ہاتھ مارا اور اسے لے کر کلب کے اندرونی حصے میں آ گئے۔

”کام دام چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ ناشتہ کرو گے؟“

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہوں شاباش۔ اویار کا کے! ناشتہ تو لے آ۔“

انہوں نے کسی کو آواز دی۔

انیس بھائی ہمیشہ اس پر انتہائی مہربان رہتے تھے وجہ سکندر خود بھی نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس سے کمال درجے شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ دوسرے لڑکوں کو تو وہ معمولی معمولی سی بات پر دھتک کر رکھ دیا کرتے اور کسی میں لب کشائی کی جرأت نہ ہوا کرتی تھی۔

”ہاں بیٹا! اب بول۔“ ناشتے نے فارغ ہو کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”انیس بھائی! میرا ایک کام کر دیں۔ میں ساری زندگی احسان پسند رہوں گا۔“

”اوہ گولی مارو احسان مندی کو۔ تم کا ہم پولا!“

”مجھے نوکری چاہئے!“

”کیسی نوکری؟“

”کیسی ہی نوکری کیوں نہ ہو۔ جس حلال کے در پیے ملتے ہوں۔“

”ہوں! ڈرائیوری کرو گے؟“ وہ فوراً بولے۔

”جی؟“ اس نے تعجب سے ان کی شکل دیکھی۔

”دیکھو! میرے ایک جاننے والے ہیں۔ بڑے پیسے والے لوگ ہیں! انہیں ایک

با اعتماد ڈرائیور کی ضرورت ہے۔“

”لیکن انیس بھائی مجھے تو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ نہ میرے پاس لائسنس نہ تجربہ! میں بھلا

یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟“

”وہ تم انیس بھائی پر چھوڑ دو۔ گاڑی چلانا میں تمہیں ہفتہ بھر میں سکھا دوں گا۔ باقی ہر

چیز میرے ذمے۔ یہ کہو! شان تو نہیں گھٹے گی؟ تمہارے جیسے بالشت بالشت بھر کے چھو کرے دو

تاغیتیں پڑھ کر خود کو چیف منسٹر سے کم نہیں سمجھتے!“

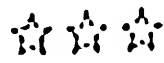
وہ ہنس دیا۔

”چیف منسٹر کیا انیس بھائی! ہم خود کو پرائم منسٹر بھی سمجھیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ رہیں

گے تو وہی بالشت بھر کے بے قیمت چھو کرے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں تو میں

راشٹی ہوں۔ اتنی جلدی اپنا کام بن جانے پر وہ خود بھی حیران تھا۔

”بس تو پھر شرم سے میرے پاس آنے لگا ہفتہ بھر بعد میں تمہیں لے پلاؤں گا۔“
 ”میں... میں ہفتہ بھر میں سیکھ سکوں گا؟“
 ”ارے تمہارا باپ بھی سیکھ لے گا!“ وہ جوش سے بولا۔
 اسے ہنسی آگئی تھی۔



جس عالی شان کوٹھی پر انیس بھائی اسے لے کر گئے تھے اسے باہر سے دیکھنے پر ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ شان و شوکت نہ دیکھی تھی۔ اندر پورٹیکو میں لائن سے چار چیمپاتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ملازم کی ہمراہی میں وہ دونوں آراستہ، پیراستہ وسیع ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔

”ہٹھو سکندر!“ انیس بھائی نے بیٹھے ہوئے اسے بھی اشارہ کیا۔ اس نے قیمتی صوفوں کو ایک نظر دیکھا اور کھڑا ہی رہا۔

”ہٹھو بیٹا!“ انہوں نے اس کا تامل دیکھ کر ہنس کر کہا۔

وہ بادل نخواستہ ایک صوفے کے کنارے پر ٹک گیا۔

”ہیلا انکل!“ بجلی کی رفتار سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

سکندر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ ڈرائیور لے آئے ہیں۔“ وہ انیس بھائی سے مخاطب تھی۔ ”اتنے دن بعد؟“

کب سے میں ڈیڈی کی جان کھارہی ہوں اور ہر بار وہ مجھے جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے آپ

سے کہہ رکھا ہے اور آپ بہت اچھا باڈرائیور ڈھونڈ کر دیں گے۔ میں دن بھر گھر میں پڑی پوری رہتی

رہتی ہوں جب سے وہ پرانا ڈرائیور نوکری چھوڑ کر گیا ہے مجھے باہر نکلنے کی پریشانی نہیں ملتی۔

ڈرائیونگ سیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ نجانے ڈیڈی کو مجھ سے کسی خطرناک ایکسیڈنٹ کی امید

ہے جو وہ مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر محض بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔“ وہ نان سٹاپ بولتے بولتے رکی پھر اس

کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”اوہ۔ یہ؟ انکل یہ ڈرائیور لائے ہیں آپ؟“

”السلام علیکم!“ وہ جلدی سے بول پڑا۔

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“ وہ دوبارہ انیس بھائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ”یہ ڈرائیور ہے یا

انگریزی رسالوں سے نکالا ہوا ماڈل؟“ وہ بے تکلفی سے تہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

”بیٹا! تم بھی ہمیشہ اپنے جیسی بات کرتی ہو! خوبصورت اور انوکھی۔“

نجانے وہ اس بات کے جواب میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کے داہوئے لب اندر داخل ہوتے مگر بے بالوں والے باوقار شخص کو دیکھ کر دوبارہ جڑ گئے۔

”السلام علیکم سرجی!“ انیس بھائی بڑے احترام سے کھڑے ہوئے تھے۔

سکندر نے بھی تقلید کی۔

”والسلام!“ انہوں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے بیٹھ گئے۔

”بڑے دن لگا دیئے انیس! ثانی نے مجھے ان چند دنوں میں کتنا اپ سیٹ رکھا ہے۔“

”سرجی! اعتماد کا بندہ ڈھونڈنے میں بھی تو دقت لگتا ہے نا۔ یہ سکندر بخت ہے۔ اسی کو

لایا ہوں میں!“

”ہوں!“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ ”کتنا تجربہ ہے اسے؟ لگتا تو نو آزمودہ ہے۔“

”اندازہ درست ہے آپ کا سرجی!“

”نہیں انیس۔ یہ نہیں!“ انہوں نے یکجہت فیصلہ دے ڈالا۔ ”یہ کسی طور مناسب نہیں“

تم بے شک چند دن اور لے لو۔ کوئی اور بندہ تلاش کر لو۔“

”جی بہتر سرجی!“ وہ سر جھیکا کر بولے۔

سکندر کے اوپر منوں! اس آگری۔ کتنی محنت، کتنی لگن سے اس نے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔

کتنے کتنے گمنام پریکٹس کی تھی اور اس شخص نے کتنی آسانی سے اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ واقعی اس دنیا میں بہت حقیر سادہ جود لے کر آیا تھا۔

انیس بھائی نے اٹھ کر اس شخص سے ہاتھ ملایا۔ سکندر کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی سرجھکا

کر ہوئے سے سلام کر لینے پر ہی اکتفا کر کے وہ باہر نکل آیا۔ آتے آتے ایک بار اس کی نظر اس

لوہی سے دوچار ہوئی تھی۔ نگاہوں میں دلچسپی بھرے پنجاب شہر سے دانتوں میں دبائے وہ

اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کا جود کوئی عجب تھا۔ بایو جینز اور سرخ ٹی شرٹ میں ملبوس اس کی وہ

ننگا سکندر کے دماغ سے چپکی رہی۔ ہر چند کہ اس کی نظروں میں حقارت یا طنز نہ تھا لیکن وہ جو خود

اول و دماغ کی تمام تر شدتوں سے حقیر بے مایہ اور کمتر سمجھنے لگا تھا اسے اب ہر نگاہ یکساں لگتی تھی۔

”بیٹا! بد دل مت ہو۔“ باہر نکل کر انیس بھائی نے اس کی کمر تھپکی۔ ”یہ نہ سہی کچھ اور سہی۔ اصل میں یہ حیات خان صاحب کچھ الگ مزاج کے آدمی ہیں۔ کبھی مٹی کو سونا سمجھ لیتے ہیں کبھی سونے کو مٹی کر دیتے ہیں یا شاید انہیں تمہاری عمر پر اعتراض ہو یہ جوان کی بیٹی ہے نا ثانیہ۔ کچھ عجب طبیعت کی لڑکی ہے۔ آزاد خیال اور آزاد منش، فکر مند رہتے ہیں اس کی طرف سے۔ شاید اسی خیال سے انہوں نے تمہیں رکھنے میں تامل کیا ہو۔ خاص الخاص ثانیہ کو ہی تو ضرورت ہے ڈرائیور کی۔“

”آپ کیسے جانتے ہیں ان لوگوں کو؟“ اس نے دھیان بنانے کے لئے سوال کیا۔

”کسی زمانے میں سیاست میں ہوتے تھے خان صاحب۔“ میں باڈی گارڈ تھا ان کا۔ پندرہ سال نوکری کی ہے میں نے ان کی۔ بڑا اعتبار کرتے ہیں مجھ پر دیکھا نہیں ثانیہ مجھے انکل کہتی ہے؟“ انہوں نے فخر سے کہا۔ گویا ثانیہ کا ان کو انکل پکارنا ان کے لئے بڑی شان کا باعث تھا۔ وہ سڑک پر پڑے پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑاتا چلتا رہا۔ فی الوقت دنیا کی کوئی شے کوئی تذکرہ آس سکے۔ لئے دلچسپی کا باعث نہ تھا۔

”میں جلد ہی کوئی انتظام کر دوں گا تمہارا!“

رخصت ہوتے وقت انہوں نے اسے تسلی دی۔

”جی!“

اس نے آہستگی سے کہا اور ہاتھ ملا کر چلا آیا۔

☆☆☆

زندگی کی جیونٹی کی سی رفتار میں دلچسپ تیزی کی ایک لہر آئی تھی۔ یاد پندرہ دن کی چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ موسم بھی بہار کا تھا اور سکندر کے لئے بہار در بہار کا موسم تھا۔

”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ دنیا میں میں قطعاً تنہا نہیں ہوں۔“ وہ بہت دیر تک اس سے لپٹا رہا۔

”میرا ایک یار بھی ہے۔“

”کیسی گزاری؟“ وہ علیحدہ ہوا۔

”سب کچھ لگتا تو رہا ہوں تمہیں۔“ سکندر پینکی سی ہنسی بنسا۔ ”مزید کیا حال بتاؤں۔“

”تہہارے خطوط سے تو لگتا تھا نیلی نہیں زرد و شانی سے تحریر کئے گئے خطوط ہیں۔ اتنی

اس اتنی دل گیری! یار شرم کبر و ستندر! جوان آدمی ہو۔“

”اواسی اور دل گیری بڑھانے سے شرط ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔ لیکن جوانی میں ملنے والے دکھ درد انسان مسکرا کر چلی جاتا ہے۔“

”نوسالے عمر سے نہیں احساس تنہائی سے ٹوٹتے ہیں یاد رکھو! دکھوں سے ٹوٹتے شانوں پر

بب کسی ہمدرد کی محبت ہاتھ نہ رکھے تو بھلا کہاں کی امت اور کیسا حوصلہ۔ کس کے لئے ہے انسان کس کی خاطر نبرد آزار ہے؟“

”تم نے اسے آزمایا تو نہیں ہے ناں سکندر! پھر یہ بیٹنگی مایوسی کیا معنی رکھتی ہے۔“

”آزماؤں تو تب جب وہ مجھے اتنا حق دے۔“ وہ پھسکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ”مجھے اس بو

نہیں اپنی قسمت کو آزمانا ہے جس نے مجھے کبھی ذرا سی تسلی نہیں دی۔“

”ایک مشورہ دوں سکندر!“ یاد رہے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”یہ مت کہنا کہ اس کا خیال دل سے نکال دوں۔“

”پھر کیا کہوں؟ یار سکندر!“ وہ زچ ہوا۔

”مت چل اس راہ پر یار! آگے کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں۔“

”پھر بھی یاد رکھو! میرے پاس ایک کمونا پیسہ بھی نہیں لیکن یہ جوانی ہر حال میں

خیالوں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا مختصر سلسلہ آیا۔

”اٹنے بے غیرت۔“ پھر یاد رہے اچانک ماحول تبدیل دیا۔ ”اتنے آرام سے بیٹھا

بے پاس ہونے کی نہ خبر دی نہ منہ ہی میٹھا کرایا۔ مگر میں اتنا بے خبر نہیں ہوں۔“

”چہرہ زو یار۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”چھوڑ دیا ہے میں نے پڑھنے لکھنے کا خیال!“

”ہاں میں۔“ وہ کیوں؟ مانع تو نہ کھانے ہے محترم کا؟“

”یار! نہیں جیسا جاتا مجھ سے فقیروں کی طرح۔ اب مفت کی روٹیاں توڑتے شرم آتی

بہت تھکتے۔ پھر کھانا پاتا ہوں مگر وہی ہی ہی۔“ وہ تھکتے تھکایا بہ اتنا۔

”ہوا کیا ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

سکندر نے اسے فیس مانگنے سے انکار دیا پس رکھ دینے تک کی تمام امانت ادا کی۔

”تھوڑا ذلیل اور ہولوسکندر! کم از کم تمہاری گریجویشن تو ہو جائے۔“

”چھوڑو یار! کیسی گریجویشن۔ ایک بے کاری ڈگری کے لئے بھی لیا مل جائے گا۔“

”اور جب ایک بے کاری ڈگری بھی ملے نہ ہوگی تو پھر کیا کر دے؟“

”پتھر کوٹوں گا، سر کیس بناؤں گا۔“ وہ از حد تلخ ہو رہا تھا۔

”چاچا اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ ایک مزدور کو ہرگز نہیں دیں گے۔“ یادو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کتنی مذاق میں اڑانی چاہی۔“

وہ خاموش بیٹھا نگلی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔

”مجھے مزدور بنانے کا سہرا بھی چچا کے سر ہی ہو گا۔“ پھر اس نے خاموشی توڑی۔

”سکندر! تم اپنے باپ کے پاس!“

”یادو پلیز! آگے کچھ مت کہنا۔ جو باپ مجھے پیدا کر کے بھول گیا۔ میں بھی جیتے جی

کبھی اسے نہیں پکاروں گا اور تم ٹھیک کہتے ہو، میں جوان آدمی ہوں اور اس جوانی میں اور کچھ نہ بولنا

ضرور ہوتی ہے۔“

”سکندر یار! میں تجھے زندگی میں بہت کچھ بنتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ یادو بے چارگی

سے بولا۔

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے

اک خواب میں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا!

وہ ادا سی سے مسکرا دیا تھا۔

❖ ❖ ❖

”سکندر!“

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بلیک کائون کے سوٹ پر پرندہ دوپٹہ اور ہلے سلیٹے سے چوٹی بنا

کر آئے اگلے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہاں کہو کچھ کام ہے؟“

”ہوں!“ اس نے اضطراب سے ہاتھ مسے۔ ”وہ ذرا مجھے ٹیکسی لادو۔“
 ”کہاں جاؤ گی؟“

وہ اٹھ کر شرٹ پتلون کے اندر کرنے لگا۔

”دوست کے ہاں جاؤں گی۔ اماں گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آئیں تو تم انہیں بتا دینا پلیز۔“
 سکندر نے ذرا غور سے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھی۔

”عند لیب! تمہیں چچی جان سے پوچھ لینا چاہئے تھا۔“

”ہاں ہاں! میں آ کر انہیں بتا دوں گی۔ وہ اصل میں مجھے صبح پوچھنا یاد نہیں رہا۔“

وہ خلاف توقع بڑی نرمی سے بات کر رہی تھی۔ سیاہ لباس میں اس کی ملیح رنگت بڑا

تاثیر دے رہی تھی۔ ہمیشہ سادہ رہنے والی عند لیب آج بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔

بٹنوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک جمی تھی۔ آنکھیں آئی لائسنر اور مسکارا سے جلی ہوئی تھیں۔

سکندر باوجود کوشش کے اس پر سے جلد نظر نہ ہٹا سکا۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے

کینے سے عند لیب کے گال لمحہ بھر کے لئے لودے اٹھے تھے۔

”جلدی جاؤ نا پلیز۔“ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ ٹیکسی لے کر وہ آیا تو وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

”تم اکیلی جاؤ گی؟ میں چلوں تمہارے ساتھ؟“

”نہیں نہیں شکریہ!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں تو عادی ہوں معمول کی بات ہے۔“

پھر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دی۔

”میں جلدی لوٹ آؤں گی اماں کو بتا دینا۔ ہاں!“

”ہوں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا اس کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا۔ وہ دن کتنا

نہا کتنا خوبصورت تھا۔ روشن چمکدار عند لیب کی مسکراہٹ سے بھرا ہوا۔

اسے ہر سو وہ مسکراہٹ بکھرتی نظر آتی رہی وہ آنکھیں چمکتی دکھائی دیتی رہیں۔ اس

سارے گرد اجالے اترتے رہے جگنو بکھرتے رہے۔

”یادو! یادو! آج میں بہت خوش ہوں بہت خوش!“ رات کو یادو سے ملاقات پر اس

نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

”کیا ادھر سے اظہار ہو گیا ہے؟“ وہ گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

”ارے!“ وہ زور سے ہنس دیا۔ ”اس دن تو میں خوشی سے مر جاؤں گا۔“

”پھر کیا ہوا ہے؟“

بھولے سے مسکراتے ہوئے تھے وہ آج فیض

مت پوچھ دلو لے دل ناکردہ کار کے!

یادِ احمقوں کی طرح اسے گھورتا رہا۔

☆☆☆

دوپہر سے اس کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ موسم کے بدلنے کا اثر ظاہر ہو رہا تھا۔ سر

درد کی وجہ سے وہ خاموشی سے چادر لئے بیٹھا ہوا تھا۔

اندر کوئی ہمسائی کافی دیر سے بیٹھی اپنی کرخت آواز میں زمانے بھر کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کر رہی تھیں اور ان کی آواز اسے سخت بری محسوس ہو رہی تھی۔ دل پر جبر کئے وہ خاموشی سے لیٹے رہنے پر مجبور تھا۔

”ارے بہن! یہ لڑکیاں تو گلری کی نیل ہوتی ہیں۔“

غالباً انہوں نے سکول سے آئی حسد اور شہناز کو دیکھ کر بات شروع کی تھی۔

”کل یہی بچیاں مٹی کے پرتوں سے کھیلا کرتی تھیں آج ہانڈی روٹی سنبھال رکھی

ہے۔“

”ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو۔!“

چچی کے لہجے کی بیزاری کہتی تھی کہ انہیں اپنی بیٹیوں تک چلے آنے والے تبصرے سے اب الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

”اب اپنی عندا لب بیٹی کو دیکھو۔ ماشاء اللہ کیسی سیانی ہو گئی ہے۔ ناک نقشہ بھی اچھا

نکل آیا ہے کہیں سنگنی دگنی کی؟“

”ابھی کہاں۔“ چچی نے بات مالی نہ ابھی تو پڑھ رہی ہے۔“

”اے تو کیا سنگنی کے لئے بھی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر دگی؟ کہیں بیٹے کا نے سے توڑ

”.....جوان لڑکی ہے۔“

”اے ہاں۔ دیکھوں گی۔ کوئی اچھا ڈھنگ کا رشتہ بھی تو آئے تا۔“ چچی بھنسی گئی۔

”ہاں یاں بہن! جو کرنا دیکھ بھال کر کرنا۔ دیے یہ تمہارا بھتیجا کیا کرتا ہے؟“

”خاک کرتا ہے۔“ جہاں سے سکندر نے گفتگو کو بغور سننا شروع کیا وہیں چچی جان جل

کر خاک ہوئی تھیں۔

”شکل و صورت کا اچھا ہے۔“ چچی کے انداز پر ہمسائی دبک گئیں۔ ”میں نے تو اس

لئے کہہ دیا۔“

”اے بی بی! تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ جس دن کسی قابل ہو گیا میں تمہاری

بٹی کا ہاتھ ناگ لوں گی تم سے۔ میری بیٹیوں کو رشتوں کی کمی نہیں۔“

”نہ بھئی۔ جسے اپنے نہ دیں اس پر بھلا پرائے کیا بھروسہ کریں گے۔“ ہمسائی نے

پاؤں پلنگ سے اتار کر چپلیں ٹٹولیں۔ ”میں نے تو یونہی کہہ دیا۔ اچھا بھائی کہا سنا معاف کر دینا۔

چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ چچی نے لٹھ کھینچ مارا۔

ہمسائی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ تادیر بڑبڑاتی رہیں۔

”اے لو میری بیٹیوں کی فکر انہیں دبلا کئے جا رہی ہے۔ ہمیں نظر نہیں آتا جو یہ مشورے

دینے آن پہنچیں۔ سارے زمانے کے کھٹو بے کار مفت خورے میری بیٹیوں کے لئے رہ گئے

ہیں۔“

وہ دم سادھے لیٹا رہا۔ سردرد میں یکنخت کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ کنپٹیوں پر جیسے کوئی

ہتھوڑے برسار ہاتھا۔ اسے لگا کچھ دیر میں اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی یا اس کی

کھوپڑی تڑخ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ چند لمحوں میں اس کا پورا جسم بری طرح سے

پسینوں میں نہا گیا۔

”کیا زبان سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ نثر ہے۔ کیا اس سے زیادہ کڑوا اور تلخ“ جان لیا

زہر آج تک کسی کو دیا گیا ہے۔ شاید پگھلا ہوا سیسہ سماعتوں کو اتنی تکلیف نہ پہنچاتا جتنی کہ ان الفاظ

نے پہنچائی ہے۔“

شدت غم سے اس کا پورا وجود پھٹکنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہو

چکا تھا۔

☆☆☆

”سکندر بھائی۔“

وہ تیسرا دن تھا جب اس کا بخار ٹوٹا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے حسنہ

کھڑی تھی۔

”باہر انیس بھائی کھڑے ہیں۔ آپ کو بلارہے ہیں!“

وہ بمشکل اٹھا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا باہر پہنچا۔

”ارے شیر! یہ کیا حالت ہے؟“ وہ اسے دیکھ کر چونک اٹھے۔

”السلام علیکم انیس بھائی۔“ وہ بمشکل مسکرایا۔

”والسلام۔ نصیب دشمنان! یہ کیا حال بنا رکھا ہے مجنوں کی جانشینی کا ارادہ تو

نہیں؟“

”بچپلے تمن دن سے بخار تھا۔ آج اتر رہا ہے۔“

”چلو پھر ایک خوشخبری سن لو۔ حیات خان صاحب کا فون آیا تھا۔ تمہارا کونٹیکٹ نمبر

انگ رہے تھے۔ میں نے کہا نمبر وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ مسج دے دیں۔ بولے اس لڑکے سے کہو

کہ کل سے نوکری پر آ جائے۔ بولو خوش؟“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں انیس بھائی؟“ اسے یقین نہیں آیا۔

”لو۔۔۔۔۔ آج سے پہلے کتنا جھوٹ بولا ہے تم سے۔“ وہ ناراض ہوئے۔

”تمہیں یو انیس بھائی۔ بہت شکریہ۔“ اس نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ان

کا ہاتھ دبایا۔

”میں آج ہی وہاں جاؤں گا۔“

”ارے آج نہیں کل آج تو ریٹ کر دو۔ جلیہ سدھار داپنا۔“

”تمہیک ہے۔۔۔۔۔ بہت بہتر!“

وہ اندر آیا۔ بیماری خود بخود درخست ہو چکی تھی اور وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اندر چچی کیاریوں کے پاس کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔

”پتی جان! مجھے نوکری مل گئی ہے۔“ وہ خوشی سے بھرپور لہجہ میں ہوا۔ بچپلے دنوں کی کدورت و کثافت خود بخود دل سے دھل گئی تھی۔

”کیا لگ گئے ہو؟“ انہوں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ وہ پل بھر کو شرمندہ

ہوا۔

”جی..... وہ نوکری تو معمولی سی ہے۔ ڈرائیور۔“

”ڈرائیور؟“ وہ طنزیہ انداز میں اس کی بات کاٹ گئیں۔ ”لو بھئی اس کی کسرتھی!“ پیڑ پڑ کرتی وہ اندر چلی گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ہر چند کہ بہت کچھ کہنا بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کسی بڑے مقام پر نہ پہنچ سکا تھا تو اس میں کس کا قصور تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری کس نے بخوشی قبول کی تھی اور پھر کس حد تک نباہی تھی؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ڈرائیور کی نوکری پر ناک بھوں چڑھانے والی اس خاتون کا تعلق کس شاہی خاندان سے تھا؟ اس کے شوہر کی کپڑے کی کتنی بڑی دکان تھی؟ اس کے بیٹے مستقبل میں کیا کچھ بن سکتے تھے؟ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ سارے سوال تلخ گھونٹ بن کر اس کے حلق سے اترتے چلے گئے اور ایک حرف بھی شعلہ بن کر باہر نہ آ سکا۔

اگلے روز صبح نو بجے وہ کونٹھی کے مرکزی دروازے پر تھا۔ چوکیدار نے اس کی آمد کی اطلاع اندر بھیج دی تھی اور کچھ دیر بعد ملازم جواب لے کر آ گیا تھا۔

”بی بی جی ابھی سو رہی ہیں۔ ڈرائیور کو اندر بٹھا دو۔“ ساڑھے گیارہ تک وہ ہونٹوں کی طرح وہاں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا آ نکہ اندر سے بلاوا آ گیا۔

وہ پورٹیکو میں چیمپاتی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے ادب سے سلام کیا۔

”ہوں۔“ اس نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ ”کل تمہیں وردی مل جائے گی۔ اس طرح تو تم ڈرائیور کم میرے بوائے فرینڈ زیادہ لگتے ہو!“ اس بے تکلفی پر وہ قدرے پریشان ہوا۔

”یہ اوجھل ہے۔ دروازہ کھولو۔“

اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ پچھا: ذرا ان اک کیا اور ادب سے اس کے داکر دیا۔
وہ بڑی شان اور تمکنت سے براجمان ہوئی تھی۔

”کہاں لے چلوں؟“

”میرا نام ثانیہ ہے۔ تم مجھے ثانی بی بی کہہ سکتے ہو!“

”کہاں لے چلوں ثانیہ بی بی؟“

”نی الحال تو میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کیسی ڈرائیور کرتے ہو۔ گاڑی باہر نکالو اور

مین روڈ پر لے چلو۔“

اس کا تجربہ محض دس بارہ دنوں پر مہیا تھا۔ اس کی بات سن کر نجانے کیوں اس کے

ہاتھوں میں خفیف سی لرزش آگئی۔ بدقت تمام اس نے گاڑی باہر نکالی اور احتیاط سے ڈرائیو کرتا ہوا

مین روڈ پر لے آیا۔ ٹریفک عام دنوں کی نسبت قدرے زیادہ تھی۔

”بیز..... دیری بیز۔“ وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔ ”مسٹر ڈرائیور! کیا نام ہے تمہارا؟“

”سکندر بخت!“

”ہوں۔ اچھا نام ہے۔ مسٹر سکندر۔ کب سے گاڑی چلا رہے ہیں آپ؟“

”آج بارہوں دن ہے جی۔“

”واٹ؟“ وہ حیران ہوئی۔

پھر نجانے کیوں زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی پھوار اس کے اعصاب پر کنکروں کی

طرح برس رہی تھی۔ اسٹیرنگ پر اس کی گرفت ہلکی پڑی اور گاڑی کسی شرابی کی طرح لہراتی ہوئی

ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی پھر وہ بڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی تھی اگر وہ بدقت

بریک نہ لگاتا تو حادثہ سنگین ضرورت بھی اختیار کر سکتا تھا اور اس وقت بھی اسے اپنی نااہلی کا احساس

تھا۔

”مسٹر ڈرائیور! پھر وہ بولی۔ ”کچھ علم ہے تمہیں تمہارا امتحان کیسا رہا؟“

”آئی ایم سوری ثانیہ بی بی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”آپ چاہیں تو فوری طور پر مجھے

نوٹ کری سے الگ کر دیں اور چاہیں تو صرف ایک ہفتہ مزید دے دیں۔ میں معمولی سے معمولی نکات

بھی۔ یکہ اوس کا۔“

”اوہ۔ بہت بھروسہ ہے خود پر؟“ وہ طنز سے بولی۔ ”خیر، کارر پورس کرو اور واپس لے

کر چلو۔ فی الحال تو مجھے جان عزیز ہے۔“

آہستگی اور احتیاط سے ڈرائیو کرتا وہ واپس کوٹھی تک گاڑی لے آیا۔

”بس بس یہیں روکو۔“ اس نے قدرے فاصلے پر گاڑی رکوالی۔ ”اب باہر نکلیں آؤ۔“

اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی دروازہ کھول کر باہر آئی تھی۔

”چابی مجھے دو اور تم گھر جاؤ!“

”لیکن... آپ کو تو ڈرائیو کرنا نہیں آتا۔“ وہ تعجب سے بولا۔

”تمہیں آتا ہے؟“ وہ پھر زور سے ہنسی۔ اس نے جھینپ کر چابی اس کی جانب بڑھا

دی۔

”اب میری بات غور سے سنو۔ ڈرائیونگ مجھے آتی ہے لیکن اس کا علم ڈیڈی کو نہیں

ہے۔ لیکن آج میں انہیں بتا دوں گی اور یاد رکھو۔ گاڑی تم سے نہیں مجھ سے بے قابو ہو کر درخت

سے ٹکرائی ہے۔ کیا سمجھے؟“

”جی؟“ اس نے شدید حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

”جو کہا ہے بس اسے یاد رکھنا۔ تم یہاں میری پرزور سفارش پر رکھے گئے ہو اور میری ہی

شکایت پر نکالے بھی جاسکتے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سفارش پر رکھا گیا شخص اس قدر نااہلی کا

ثبوت دے۔ اس لئے یہ پہلی غلطی میں اپنے سر لے رہی ہوں۔ تم ایک ہفتے بعد آنا اور اپنے دعوے

کو درست ثابت کر کے دکھانا سمجھے؟“ ہر چند کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا پھر بھی اس نے اثبات میں

سر ہلایا اور اسے سلام کر کے چلا آیا۔

”نجانے دنیا کتنے بٹوبوں سے بھری پڑی ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

ہفت ہفت ہفت

اس دن کی طرح پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا تھا اور وہ کتابیں سنبھالے باہر نکلتی رہی

تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے ٹکرایا اور اس کی کتابیں فرش پر بکھر گئیں۔

”عند لیب!“ اس کی کتابیں اکٹھی کر کے اسے تھما کر وہ بولا۔ ”میری جاب کی مبارکباد

نہیں دی تم نے۔“

”مبارک باد۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ”کیا بننے کی؟ کیا تم اس پھلچری جاب کو

اپنے کیریئر کا آغاز کہتے ہو؟“

”نہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔ ”زندگی میں جو کچھ میں حاصل کرنا چاہتا ہوں، فی

الحال تو ایسا کرنے سے وہ سب کچھ میری دسترس سے مزید دور ہو گیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ برائی تو

نہیں ہے۔ میں تو صرف خود پر سے کچھ مخصوص قسم کے لیبل اتارنا چاہتا ہوں جو وقتاً فوقتاً مجھ پر

چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ میں بہت کچھ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں، کچھ عرصے کے لئے ڈرائیور بننے

سے میری خواہشات، انگلیں اور حوصلے مر تو نہیں جائیں گے؟“

”پھر؟“ وہ قدرے بیزاری کا شکار نظر آنے لگی۔ ”کس بات کی مبارکباد چاہتے تھے

مجھ سے؟“

”میں تو محض تمہارا رد عمل دیکھنا چاہ رہا تھا!“ وہ مسکرا دیا۔ ”اس گھر میں ہر شخص مجھ سے

خفا سا ہے۔ میرا یہ نوکری کر لینا غالباً چچا کے نام کو بیڑ لگا رہا ہے۔“

”اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری حوصلہ افزائی کروں تو یہ ناممکن ہے۔ میں بھی کچھ

ترجیحات رکھتی ہوں اور ایک مخصوص سطح سے نیچے اترنا پسند نہیں کرتی۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تم مادیت پسند ہو؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا اور یہ سوال

پوچھتے وقت اس کی تمام تر کسری کا احساس اس بری طرح سے چھایا ہوا تھا۔ عندلیب کا اذکار میں

جواب اس وقت اسے بڑا جذباتی قسم کا حوصلہ بخش سکتا تھا۔

”ہاں۔“ لیکن وہ صاف لہجے میں بولی۔ ”میں بہت مادیت پسند لڑکی ہوں لیکن آئندہ

زندگی اس سے برتر طبقہ میں گزارنا چاہتی ہوں۔ اس سے مزید نیچے آنا میرے لئے ناممکن ہے۔“

پھر وہ اس کے برابر نئے گزر کر باہر نکل گئی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے تادیر وہاں کھڑا

رہا۔ اس نے ہر چند کہ کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن وہ ہر بات کا جواب دے گئی تھی۔ وہ تمام باتیں جو ان

کے درمیان ہوئی تھیں کہے بغیر اپنی وضاحتیں ان دونوں کے ذہنوں پر ثبت کر گئی تھیں۔ سکندر نے

چند نظموں میں سب کچھ کہہ کر سب کچھ پوچھ لیا تھا اور اس نے بڑی فصاحت سے ہر بات کی تشریح

کر دی تھی۔

کہنے اور سننے کو غالباً اب کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

☆ ☆ ☆

”یاد رہے! تم نے کہا تھا کہ محبت کی راہ پر چلنے سے پیشتر یہ ضرور باور کر لینا چاہئے کہ ضروری نہیں دوسری سمت سے بھی کسی کے قدم آپ کی طرف بڑھتے ہوں۔ لیکن یہ عجب راہ ہے یاد رہے۔ اس دوسری سمت میں اتنی کشش اس قدر جاذبیت ہوتی ہے کہ قدم روکنا محال ہوتا ہے اور ہر قدم پر ہزار ہا خوش فہمیاں ست رنگ جال بنتی ہیں لیکن آج ہر جال تار تار ہو گیا ہے ارے رنگ اڑ گئے ہیں اور اب اس راہ پر دور دور تک دھول اور خار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس دوسری سمت کی جاذبیت اور کشش روز اول کی طرح برقرار ہے۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر شخص کے گرد اس کی خواہشات کا مضبوط جال ہوتا ہے جس میں سے کسی دوسرے کی خاطر نکلنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ میری خواہش ہے کہ وہ جو چاہتی ہے اسے مل جائے۔ میں نے خدا سے اپنے لئے کبھی اتنی خوشیاں نہیں مانگی ہیں جتنی اس کے لئے چاہی ہیں۔ اس موقع پر فینش کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا

ہجوم یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
دور درد سے سیما ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے

غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا

شاید اس نظم کو پڑھ کر تم میری کیفیت محسوس کر سکو۔

تمہارا دوست سکندر!

☆ ☆ ☆

ایک نفعے بعد وہ وہاں پہنچا تھا اور قدرے پر اعتماد تھا۔

”آپ کو صاحب اندر بلاتے ہیں۔“ ایک ملازمہ نے اس کے اندر بھیجوائے پیغام کے

جواب میں آ کر مرثوہ دیا تو وہ حیران سا ہوا۔

ملازمہ کی رہنمائی میں وہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اندر صرف حیات خان

صاحب تھے۔

”السلام علیکم۔“

”والسلام۔ بیٹھ جاؤ۔“

وہ تھکنا ایک صوفے کے کونے پر ٹک گیا۔

”تمہیں یہاں ثانی کی فرمائش پر رکھا گیا ہے۔“ انہوں نے ایک دم بات کا آغاز کیا۔

”میرا اپنا فیصلہ ہر چند کہ اس فرمائش کے قطعی برعکس تھا۔ لیکن ثانی کی بات ٹالنا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔“

وہ خاموش بیٹھا ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔

”اس لئے بھی کہ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے اور اس لئے بھی کہ وہ بیمار ہے۔“ وہ رک کر

بڑکے۔ سکندر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”وہ کبھی کبھی دماغی دوردوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی ذہنی کیفیات نارمل نہیں رہتیں۔“

یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تمہارا یہ سب کچھ جاننا اور یاد رکھنا ضروری ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں سر!“ وہ مودبانہ انداز میں بولا۔

”اسی لئے میں چاہتا تھا کہ میں اس کے لئے ایک بااعتماد بڑی عمر کا تجربہ کار آدمی

ڈرائیور رکھوں۔ مسئلہ یہ ہوا کہ اس نے تمہیں دیکھ لیا۔“ انہوں نے قدرے بے رکل ہو کر ادھر ادھر

دیکھا۔ ”جب تک اس کا دل تم سے بھرنے نہیں جاتا، تمہیں اس نوکری پر رہنا ہے۔ ثانی بہت جلد

ہر طرح کے انسانوں سے اکتا جاتی ہے۔ وہ خطرناک نہیں ہے لیکن کبھی کبھی وہ تم سے بری طرح بی

ہوا کر سکتی ہے اس بات کا خیال رکھنا۔“

وہ پریشان ہو چلا تھا۔ کہاں ایک سیدھی سادی سی جاب کا تصور اور کہاں یہ مشکلات۔

”اتنے پریشان مت ہو۔“ انہوں نے اس پر نگاہ کی۔ ”میں نے کہا نا وہ خطرناک یا

پائل ہرز نہیں ہے۔ بس کبھی کبھار اس کی دماغی رد بھٹک جاتی ہے اور وہ اپنے ارد گرد موجود لوگوں سے بدتمیزی کر بیٹھتی ہے۔ اپنی مرضی کرتی ہے اور کوئی اسے سمجھا نہیں سکتا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ نوکری ختم ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ اگر تم میری توقعات پر پورے اترے تو ثانیہ کے ریجیکٹ کر دینے کے بعد تمہیں آفس میں رکھ لیا جائے گا۔ میرا خیال ہے بات تم سمجھ گئے ہو۔“

”جی سر! میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں تمہیں پانچ ہزار روپے ماہوار دوں گا۔ اگر تم ان حالات کو جاننے کے بعد بھی پراعتماد ہو تو کہوں؟“

”جی سر! مجھے منظور ہے۔“

”ہوں! اب ایک آخری بات۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پاپ ساگا کر قدرے دور جا کھڑے ہوئے۔ ”نوکری کے پہلے دن تم نے ثانیہ کو اس کی مرضی کے مطابق گاڑی دے دی تھی اور وہ ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ بھی کر بیٹھی۔ تم چونکہ اس وقت تک اس کی نفسیات سے لاعلم تھے اس لئے یہ غفلت قابل معافی ہے لیکن آج کے بعد تم اسے کسی بھی صورت میں گاڑی ڈرائیو نہیں کرنے دو گے۔ اس کی نہ اسے اجازت ہے نہ ملے گی۔ سمجھ گئے۔“

”جی سر! اس نے تھوک اٹکا۔“

”اور نہ تم اس سے ہماری اس ملاقات اور اس گفتگو کا ذکر کرو گے۔“

”بہتر سر۔“

”گند۔ آج میں محض تمہاری وجہ سے ایک گنڈہ لیٹ ہو گیا ہوں۔“ انہوں نے گھڑی دیکھی۔

”تم اب انتظار کرو وہ سوکرائی ہوگی اس کا موڈ ہو تو کہیں چل جائے گی۔ ورنہ تم شام

سات بجے گھر جاسکتے ہو۔ سات بجے کے بعد اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”بہتر سر۔“

”اب تم جاسکتے ہو۔ باہر چوکیدار کا کیبن ہے تم وہاں بیٹھا کرو۔ ایسے تو یہ لڑکی روز بڑا

کہیں نہ کہیں نکلتی ہے لیکن پھر بھی یہ اس کے موڈ پر منحصر ہے۔“ وہ باہر نکل آیا۔

یہ سب باتیں جو اس سے کی گئیں اس کے لئے حیرانی اور قدرے پریشانی کا باعث

تمہیں لیکن تنخواہ اس کے لئے کافی کشش رکھتی تھی۔ زندگی اور اس میں بری طرح سے ٹھن گئی تھی اور اب وہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ گریجوایشن کا سال کسی بھی طرح سے مکمل کر کے اس نے بیرون ملک جا کر پیسہ کمانے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس مقصد کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لئے اسے کافی رقم کی ضرورت تھی یہ نوکری اسے امداد بخشی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح گیارہ بجے سے لے کر شام سات بجے تک ایک قدرے کھسکی ہوئی لڑکی کو برداشت کرنا کچھ ایسا کوحہ گراں بھی نہ تھا۔

”اور اگر یہ کوحہ گراں بھی ہوتا تو شاید میں پیچھے نہ ہٹتا۔“ اس نے سوچا تھا۔



دوسرے دن وہ آف وائیٹ کاٹن کے سوٹ پر چنا ہوا رنگین دوپٹہ اوڑھے باہر نکلی تھی۔
 چمکیلی دھوپ میں اس کے کاندھوں پر بکھرے صحت مند بال آتشیں رنگ لئے ہوئے تھے۔
 سکندر کو وہ اپنی گاڑی سے زیادہ اجلی اور چمکدار لگی۔
 ”السلام علیکم ثانیہ بی بی۔“ اس نے دروازہ داکیا۔
 ”دعیکم السلام۔“ اس نے شاید پہلی بار اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔
 ”کہاں لے چلوں؟“

”کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ کینٹ بازار لے چلو۔“

”وہ خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور گاڑی ریورس کر کے باہر نکال لی۔
 ”کہاں رہے ایک ہفتہ؟“

”انیس بجائی کی شاگردی میں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”ہوں! کانفیڈنس کافی اسپروہ کیا ہے تم نے۔ اچھا دیکھو راسٹ سائیڈ پر لے لو۔“

”لیکن۔“ اس نے بتانے کے لئے منہ کھولا کہ مطلوبہ راستہ لیفٹ پر ہے۔

”میں جانتی ہوں یہ لیکن ڈائیکن اپنے پاس رکھو۔“ اس نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔

”ڈیڈی نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ وہ بڑے سکون سے بولی تھی۔

”جی.....“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”کون ڈیڈی۔ میرا مطلب ہے جی کچھ بھی نہیں!“

”اجت!“ وہ تلخی سے بولی۔

”کون میں؟“

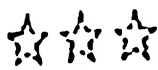
”نہیں تمہارا۔ خاموشی سے گاڑی چلاتے رہو۔“ وہ جیسے بری طرح ہمنائی تھی۔ بے مقصد ڈرائیو کرتے کرتے وہ بیراج پر آچکا تھا۔

”ہاں۔ اب واپس لے لو۔“ اطمینان سے ہدایت دی گئی۔

گویا وہ محض دریا کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی تھی جسے دیکھ کر اسے دلی سکون میسر آ گیا۔ پھر شاپنگ سنٹر میں وہ جا کر ایسی غائب ہوئی جیسے اب کبھی بھی باہر نہیں نکلا گی۔ وہ انتظار کی انتہائی تکلیف دہ صورت حال کا کئی گھنٹوں شکار رہا اور جب وہ محض ایک پکٹ اٹھائے باہر نکلتی نظر آئی تو سکندر بخت کا اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔

”تانیہ بی بی۔ آپ!“ وہ بے بسی سے محض یہی کہہ سکا۔

”پاگل نہیں ہوں۔“ وہ سکون سے بولی اور پیچھے بیٹھ گئی۔ ”چلو اب گھر چلو!“



اسے اپنا پرائیویٹ ایگزام کا فارم جمع کرانا تھا۔ دس بجے کے قریب وہ کالج سے لوٹ رہا تھا جب اس نے عندلیب کو دیکھا۔

سڑک کے کنارے پارک کی گئی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر وہ بڑے اعتماد سے اس لڑکے سے مصروف گفتگو تھی جو اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

سکندر کو ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ صبح وہ خود اسے کالج جانے کے لئے بس میں بٹھا کر آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کالج جانے کے بجائے کہیں اور گئی تھی بلکہ ایک قطعاً اجنبی شخص کی ہمراہی میں بھی تھی۔ سکندر کو مکمل یقین تھا کہ چچا میاں اور چچی جان بھی اس شخص کے وجود سے اتنے ہی لاعلم ہوں گے جتنا کہ وہ خود تھا۔

اس نے ایک فیصلہ کیا اور فٹ پاتھ پر چلتا پیچھے سے اس تک جا پہنچا۔

”عندلیب۔“ وہ اچانک ہی اس کی طرف کی کھلی کھڑکی پر جھکا تھا۔ ”یہاں کیا کر رہی

ہو؟“

اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔

”سکندر تم!“

”ہوں۔ میں ذرا کالج فارم جمع کرانے آیا تھا لیکن تم یہاں کیسے اور یہ صاحب کون

ہیں؟“

”یہ..... یہ۔“ اس کی زبان لڑکھرائی گئی۔

”یہی ہیں تمہارے کزن؟“ اس شخص نے انگریزی میں دریافت کیا تھا۔

”میرا خیال ہے تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔“ عندلیب کے سر اثبات میں ہانسنے پر وہ

پھر گویا ہوا۔

وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر اتر آئی۔ گاڑی آہستگی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ دونوں بنا

بھلا

کوئی بات کئے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

”یہ صفدر تھے۔“ پھر بالآخر وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”میری فرینڈ نائلہ کے بھائی۔“

”اگر نائلہ بھی تمہارے ساتھ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔“ وہ قدرے خشکی سے بولا۔

”ہمارے درمیان محض یہی ایک رشتہ نہیں۔“ وہ پھر بولی۔ ”ہم ایک دوسرے کو پسند بھی

کرتے ہیں۔“

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کرنوں کے بجائے تیر برسا رہا ہو۔ رگ و پے میں زہر

سرائیت کرنے لگا تھا۔ تمہیں اپنے ماں باپ کو اس بارے میں بتانا چاہئے تھا۔ ”وہ دھیمی آواز میں

بولا۔

”میں جانتی ہوں یہ غلط ہے۔ لیکن فی الحال صفدر یہ نہیں چاہتے۔ ان کی کچھ پرابلمز

ہیں۔“

”جو کبھی حل نہیں ہوں گی۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”میں مرد ہوں عندلیب۔ مرد کی اس طرح

کی پرابلمز کو خوب سمجھتا ہوں۔“

”سکندر پلیر! تم صفدر کو میرے سامنے غلط نہیں کہہ سکتے۔“ وہ تیزی سے بولی پھر اس

کے انداز میں سابقہ نرمیاں لوٹ آئیں۔ ”میں انہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں وہ غلط انسان

نہیں ہیں۔“

”بہر حال تمہارا ان سے ملنے کا طریقہ مفرد و غایب ہے۔“

”ہاں ہاں۔ کہاناں میں جانتی ہوں یہ غلط ہے لیکن محض وقتی بات ہے۔ صفدر جلد از جلد

اماں سے بات کریں گے۔ بات سنو سکندر۔ اس سے پہلے تم گھر میں کسی طرح کی ٹینشن مت پھیلا نا پالیز!

اس نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔ چہرے پر اپنی دہی ازلی نرمیاں اور ملاحتیں لئے وہ بڑی آس سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”عند لیب! دیکھو! سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ بھی قدرے رہبانیت سے بولا۔ ”اس بات کو چھپانا تمہارے لئے نقصان دہ ہوگا۔“

”اور اوپن کر دینا فوری طور پر تمہارے لئے فائدہ مند۔“ وہ تلخی سے بولی اور منہ پھیر لیا۔

وہ تکلیف دہ احساس سے دو چار ہوا اور کافی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

”میں نے تم سے کبھی کچھ مانگا نہیں عند لیب اور نہ میں اب خوش فہمیاں ہی پالتا ہوں۔ لیکن میرے بارے میں اگر تم یہ سمجھتی ہو تو خوش رہو میں کئی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

باقی کا تمام راستہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

”یاور! میں شدت سے چاہنے لگا ہوں کہ میری پسندیدگی کے جذبات کسی طور نا پسندیدگی میں بدل سکیں۔ میں اسے نا پسند کروں اور بالآخر اس کی طلب سے بیزار ہو جاؤں۔ کاش کہ میں خطوط کی جگہ واسوخت لکھنے کے قابل ہوتا لیکن ہائے یہ ابلی بے زگام۔“

یاور! دعا کرو میں اسے بھول جاؤں۔ اس کی اس بے تحاشا طلب سے بیگانہ ہو جاؤں اور اگر اب یہ طے ہی ہے کہ ہمارے راستے قطعاً جدا ہیں تو زندگی کے کسی موڑ پر مجھے اس کے وجود کی کشش آواز نہ دے۔ مجھے اس کی یاد سے کوئی واسطہ نہ رہے۔ دعا کرنا یادرا!



پہلی تنخواہ اس نے چچی جان کے ہاتھ پر لا رکھی۔ اس کے دل و دماغ میں اس وقت کہیں کوئی کھدوے میں بھی کوئی غلط خیال نہ تھا۔ نہ وہ انہیں شرمندہ کر دینا چاہتا تھا نہ کچھ جمانا اسے مقصود تھا اور نہ ہی وہ خود کو پانچ ہزار روپے ماہوار کمانے والا کوئی بڑی چیز تصور کر رہا تھا۔

اس کے دل میں تو کہیں دبی ہوئی دہی ان کہی تشنہ سی حسرت تھی۔ کوئی اسے اپنا سمجھے اپنا کہے اپنا کسی کا دست شفقت اس کے سر پر اپنا لمس چھوڑنے اور وہ محبت کی حد توں کو اپنے اندر اترتا محسوس کرے۔

”نہ بھئی۔ یہ تمہارا پیسہ ہے تم ہی رکھو۔“ چچی نے روپے یوں اسے تھمائے جیسے ان کی حرارت ناقابل برداشت ہو۔

”لیکن چچی جان! کیوں؟“ وہ حد درجے حیرانی سے بولا تھا۔ ”کیا میں... کیا میرا اس گھر پر کچھ حق نہیں؟ تھوڑا سا بھی نہیں؟“

”کیوں نہیں ہے حق۔ ہم نے کب تمہارے حقوق سے انکار کیا ہے لیکن یہ روپے میں نہیں رکھوں گی۔ کل کھاں کو تم کہو کہ چچا اور چچی نے پالنے پوسنے کی بھی قیمت وصول کر لی۔“

”میں؟ میں ایسا کہوں گا چچی جان؟ آپ آپ یہ امید بھی کر سکتی ہیں مجھ سے؟“

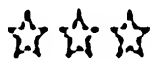
”ارے بیٹا! تم پر کوئی الزام تھوڑا ہی دھر رہی ہوں۔ آج کل تو اپنی سبکی اولاد بھی اپنی نہیں پھر بھلا غیر سے کیا امید کیا تو قے؟“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”مجھے غیر سمجھتی ہیں چچی؟“ اس کا گارندھ گیا۔ ”میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟“

”اچھا چلو جھگڑا منساؤ۔“ انہوں نے قدرے بے اعتنائی سے روپے اس کے ہاتھ سے لے لئے۔

”خدا مبارک کرے۔ خوب دے۔“

اپنی طرف سے تو وہ جھگڑا منسا کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔ لیکن وہ تادیر وہیں تخت پر بیٹھا رہا۔ احساس تنہائی اس کی رگ رگ میں کسی زہر کی طرح بھرتا چلا جاتا تھا۔ وہ جتنا دوسروں کے قریب آنے کی کوشش کرتا دوسرے اس سے اتنی ہی دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اندر سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔



زندگی یونہی اپنی پرانی ڈگر پر رواں تھی نوکری کرتے ہوئے اسے قریب دو ماہ ہو گئے تھے نہ زندگی ہی تبدیل ہوئی تھی نہ انسان۔ سب اپنے اپنے رستوں پر رواں تھے۔

”سنوڈرائیور!“

وہ اس کی ہدایت پر بیوٹی پارلر کی طرف گاڑی لئے جا رہا تھا۔ جب اچانک اس نے اسے مطالبہ کیا۔

”جی ثانیہ بی بی کہئے!“

”تم نے کبھی بتایا نہیں۔ تم میرا ہویا ان میرا؟“

”جی۔ ابھی تک تو ان میرا ہی ہوں۔“ وہ شگفتگی سے مسکرا دیا۔

”اچھا ذرا گاڑی روکو۔“

ایسے حکم وہ اچانک اور اکثر جاری کیا کرتی تھی۔ اس نے گاڑی ذرا کونے پر لے جا کر روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر اتری اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

”شٹ۔۔۔ ثانیہ بی بی۔“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”یہ۔۔۔ کیا کر رہی ہیں آپ؟“

”گاڑی چلاؤ۔۔۔ فضول سوال کیوں کرتے ہو؟“

”اپ پلیر پیچھے بیٹھئے کوئی آپ کو اس طرح دیکھے گا تو کیا کہے گا؟“

”یہی ناں کہ سینہ حیات خان کی بیٹی ثانیہ حیات خان اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی سیر و تفریح کر رہی تھی۔ سو واٹ۔“

”ثانیہ بی بی! پلیر!“ اسے کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ ”یہ آپ کا سینڈرڈ نہیں ہے۔“

”تم گاڑی سٹارٹ کر دے اس سے آگے کچھ سننا نہیں چاہتی۔“

اسے محسوس ہوا جن دماغی دوروں سے اسے روز اول سے خبردار کیا گیا تھا آج ان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میری ہر بات مانتے ہو۔“ وہ قدرے ممنونیت سے بولی تھی۔

اس نے پریشان ہو کر اس کی سمت دیکھا۔

سیاہ گلاسز لگائے ہمیشہ کی طرح بال کھولے وہ ہمیشہ ہی کی طرح بڑی فریش اور

خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے چمک دار خوبصورت بال اس کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔

”سنو ڈرائیور! کسی کو پسند کرتے ہو نا؟“

”جی۔۔۔؟“ وہ سوال پر قدرے الجھا۔

پھر اس نے جلد ہی اپنی الجھن پر قابو پا لیا۔

”جی ہاں۔ میں بہت سے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ میرے گھر والے میرے بہن

بھائی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”شاید تمہارا خیال میرے بارے میں یہ ہے کہ میں گھر میں فیڈر پل کر سوتی ہوں اور

گڑیوں سے کھیلتی ہوں۔ ہوں۔“

”میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے سامنے روڑ پر نگاہ جمائے رہا۔

”تمہاری باتوں سے مجھے یہ ہی لگتا ہے۔ ماسٹراٹ مسٹر سکندر! میں بچی نہیں ہوں۔

میں نے پوچھا تھا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو نا۔ میری مراد جیسا کہ تم سمجھ بھی گئے تھے ایک عدد لڑکی

سے تھی ایک لڑکی تمہارے خیالوں میں بسنے والے پیکر سے مشابہ۔ اس کے لمبے بال ہوں

گے لائبریریوں سے بھی آنکھیں ہوں گی اور جب وہ تم سے شرماتی ہوگی تو اس کے گال پر ہونٹیں ہو

جاتے ہوں گے۔ تم نے کبھی ماچس کی ڈبیہ میں بیر ہونٹیاں اکٹھی کی ہیں؟“

وہ جواب دیے بغیر ڈرائیونگ کرتا رہا۔ دراصل وہ اس کی بات سن کر کہیں کھوایا تھا۔

کسی گزرنے دیتے لمحے نے اس کی سوچوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر اپنے ہمیشہ کے لئے امر ہو جانے

کا احساس دلایا تھا۔

سیاہ لباس پر خوبصورت چمکتے رنگوں کا پرنڈ دوپٹہ اوڑھے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک اور لائبریریوں پر مسکارا کا بو جھ لے کر سکندر کے نظر بھر کر دیکھ لینے

سے اس کی نظریں جھک گئی تھیں اور گال پر ہونٹیں ہو گئے تھے۔

”آہ۔۔۔۔۔ یہ تعجب وراثت! یہ پرچھائیاں!“ ثانیہ نے گہری سانس بھر کر سر سیٹ سے نکال دیا

تھا۔ وہ حال میں لوٹ آیا۔

”کبھی کبھی کسی کی خاموشی میں ہمارے ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔“ بے ناں سکندر!

اس کے انداز مخاطب پر وہ شدت سے چونکا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے دیکھا اس نے گلاسز اتار

دینے تھے اور اس کی بند پلکیں ہلکی ہونی تھیں اور اس کے لب سختی سے بپٹے ہوئے تھے۔

”ثانیہ لی بی! آپ کی منزل آگئی ہے۔“

اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

”منزل! کس قدر خوش کن لڑکا ہے اور کتنا بیوقوف لڑکا ہے۔“ وہ ہنس دی۔ ”منزل کس کو ملی ہے۔ تمہاری منزل کیا ہے سکندر؟ کیا وہی لڑکی؟“

”کون لڑکی بی بی صاحب۔“ وہ نرمی سے بولا۔ ”نجانے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”کیوں جھوٹ بولتے ہو؟“ وہ اداسی سے بولی۔ ”میں جان بھی لوں تو بھلا کیا کراؤں گی۔ چلو خیر۔ نہ بتاؤ تمہاری مرضی!“

”آپ اتریں گی نہیں؟“

”نہیں مجھے واپس لے چلو۔“ سیٹ سے اس کا سر نوزلکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے خاموشی سے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔

”سنو۔!“

”جی ثانیہ بی بی! کہیں!“

”اس کا نام کیا ہے؟“

اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

”کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے شاید نہیں کرتی۔ ورنہ تمہاری آنکھیں اتنی اداس نہ ہوتیں۔ تمہاری عمر کے کسی لڑکے کو اگر کوئی لڑکی اپنی چاہتوں کا یقین دلائے تو وہ اتنا بجا بجا اٹا اداس کبھی دکھائی نہ دے۔ خواہ غم دوراں کی شدت کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔“

آج وہ اسے بات بے بات چونکا رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی گہری بھی ہو سکتی ہے۔

”اداس مت رہا کرو سکندر۔ یہ محبت کا درد بھی بہت کم بہت خوش نصیب لڑکوں کو نصیب ہوتا ہے۔ پھر زندگی کے باقی درد انہیں اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوتے۔“

”ثانیہ بی بی۔“ اس نے پہلی بار لب کشائی کی۔ ”عمر تو آپ کی بھی ایسی نہیں کہ آپ

اتنی بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ کیوں خود کو بے کار الجھاتی ہیں۔“

”میں تمہیں ابھی ہوئی لگتی ہوں؟“ اس نے ایک دم آنکھیں کھول کر پوچھا۔

”کبھی کبھی۔“

”خیرت ہے۔“ وہ براہ راست۔ ”میں تو ہمیشہ ابھی رہتی ہوں کبھی خود سے کبھی دوسروں

”کبھی چیزوں سے کبھی سوچوں سے۔“

”حیرت ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ ”آپ جیسے لوگوں کو بھی الجھنیں درپیش

ہوتی ہیں؟“

”ہم جیسے ہی لوگوں کو تو الجھنیں درپیش ہوتی ہیں۔“ وہ ہنس دی۔ ”جو سوچتے ہوں

محسوس کرتے ہوں، محبت کرتے ہوں، جیسی میں ہوں، جیسے تم ہو۔“

پھر اس نے دوبارہ سرنیک کر آنکھیں موندھ لی تھیں۔ باقی تمام راستے وہ یوں خاموش

بیٹھی رہی جیسے پتھر کا بت ہو۔

سکندر کو اس دن وہ بہت مختلف لگی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح حسب معمول گیارہ بجے گھر سے نکلا تھا۔ بس سٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے اس کو

قطعاً علم نہ ہو سکا کہ ایک گاڑی اس کے تعاقب میں ہے۔

”سنئے مسز سکندر بخت!“

اس کے پیچھے جب گاڑی آ کر رکی اور کسی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر مڑا۔ سفید

کردلا کی ڈرائیونگ سیٹ پر حفدر بیٹھا، سر باہر نکالے اس سے مخاطب تھا۔

”جی..... جی فرمائیے!“ نجانے کیوں اس کے سارے جسم میں کڑواہٹیں پھیل گئیں۔

”ایک کام تھا آپ سے چند منٹ دیں گے مجھے آپ؟“

سکندر خاموشی سے اس کے برابر آ بیٹھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”در اصل چند باتیں ہیں جو میں عندلیب کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے

منہنگو کا آغاز کیا۔ ”بایں سمجھ لیں، آپ نے میں عندلیب سے ہی کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کا مزاج کچھ

..... عجیب ہے کہ یہ سب کچھ اس سے کہہ ڈالنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ عندلیب نے مجھے آپ

..... میں بتایا تھا۔ وہ اکثر آپ کا ذکر کرتی تھی۔“

سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے جو بات میں کرنا چاہتا ہوں اسے سمجھنے کے لئے آپ بہترین شخص

ہیں۔“

”عندلیب نے کیا بتایا تھا آپ کو میرے بارے میں؟“

”وہی ایک بات جو کہ بہت عام ہی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ اس کی جڑیگات و سکناات میں بچہ سا اضطراب پوشیدہ تھا۔ ”اور عندلیب جیسی لڑکی سے اٹیچڈ ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ شی از سم واٹ ڈیفرنٹ۔ یہی ڈیفرنس اس کی اڑیکشن ہے۔“

آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟“ اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

عندلیب کی اس انداز سے تعریف اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ انا! انا! شاید مندر وہ شخص تھا جسے خود عندلیب نے یہ حق بخشا تھا۔

”سکندر صاحب! یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ میں اور عندلیب..... وی آر این لو۔“ اس کے لب اور مٹھیاں خود بخود بھیجی گئی تھیں۔

صنذر اس کی حالت سے بے خبر بولتا رہا۔

”لیکن ہمارے اسٹینٹس کا فرق ہمارے درمیان ہمیشہ سے حائل رہا ہے اصل مسئلہ میرے پیرنس کا ہے۔ عندلیب انہیں بہو کے طور پر قطعاً منظور نہیں ہے میں نے کوشش کی بہت کوشش کی کہ ہمارے درمیان موجود یہ رکاوٹیں دور ہو سکیں۔ ہم کسی طور پر یہ خلیج پاٹ سکیں۔ لیکن گزشتہ چار سالوں کی کوشش کے باوجود میں اس مقصد میں ناکام رہا ہوں۔ میرے پیرنس نہ صرف اس شادی کے مخالف ہیں بلکہ انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی صورت میں مجھے عاق کر دینے کا فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔“

دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔

”اور میں.....“ پھر اس نے ایک گہرا سانس بھرا۔ ”میں اب ہار چکا ہوں۔ میری عمر تیس برس کی ہے اور اب میں اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ میری ایک بیوی ہونی چاہیے ہوں ایک پورا پیرن آف آف ہو۔ اب یہ ٹین ایج والے کام اتنے محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ پہلی سی خوشی وہ پہلا سا لطف ہی رہا ہے چھپ چھپ کر ملنا پیار و محبت کی باتیں کرنا وعدے قبول و قرار کرنا ناؤاٹ لکس نان سینس۔ لیکن عندلیب! وہ ہمیشہ اسی عمر میں رہنا چاہتی ہے جس میں ان تمام باتوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ اب بھی وہی سوچ رکھتی ہے ذہنی طور پر وہ بہت پیچھے رہ گئی ہے اور میں بہت آگے نکل گیا ہوں۔ اب ہماری سوچوں میں توازن نہیں رہا اور میں سمجھتا ہوں اگر ہم اب

شادی کر بھی لیں تو ایک دوسرے کی کہنی ہمیں وہ پہلی سی خوشی کبھی بھی نہیں بخش سکے گی۔
 ”آپ محض اپنی بات کیجئے۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”اس معصوم لڑکی کو پیچھے بٹے کے جرم
 میں برابر کا شریک مت ٹھہرائیے۔“

”ادہ نو۔ تم غلط سمجھتے ہو!“ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ ”میں کلٹی فیل نہیں کر رہا ہوں
 نہ وضاحتیں دے رہا ہوں۔ جو کچھ میرے اندر ہے وہ سب صفائی سے بیان کر رہا ہوں۔ میں خود
 کہہ رہا ہوں کہ میں اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ عندلیب کا ہاتھ تھامنے کے ساتھ ساتھ ساری عمر کی غربت
 اور ٹھوکروں کو بھی خوش آمدید کہوں۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں ایک
 پریکٹیکل سوچ بھی رکھتا ہوں۔ میں اپنے باپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ اپنے باپ کے آفس میں
 جی ایم کے چیمبر میں بیٹھتا ہوں۔ کہیں اور مجھے شاید اکاؤنٹنٹ کی کرسی بھی نہ ملے۔ تم سمجھ رہے ہو
 نا.....“

”جی!“ وہ گہرے طنز سے بولا۔ ”میں سب کچھ صاف صاف سمجھ رہا ہوں۔ تم ایک
 امیر باپ کے عیاش صفت بیٹے جس نے چند دن ایک معصوم لڑکی میں اٹریکشن محسوس کی اس سے
 ملتے رہے وعدے اور قول و قرار کرتے رہے اور اب جب کہ تم تیس برس کے ہو چکے ہو اور جبکہ
 تمہیں ایک بیوی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو محبوبہ کی اٹریکشن اس کے بیک گراؤنڈ کی
 بد صورتیوں میں گم ہو گئی ہے۔ اب تمہیں نہ اس کا ڈیفرنٹ ہونا یاد ہے نہ اٹریکٹو ہونا اب تمہیں یاد
 ہے تو محض جی ایم کا چیمبر اور اس چیمبر سے وابستہ ساری عمر کی آسائشات اور توقعات سوا اب تم اس
 لڑکی سے کنارہ کرنا چاہتے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تم تو ذہنی طور پر آگے نکل گئے ہو لیکن وہ اب تک
 وہیں کھڑی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ بیوی کے نام پر تمہارا ذہن تو کسی بھی نئی خوبصورت اور امیر و کبیر
 خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو خوش آمدید کہے گا۔ لیکن وہ شاید تم سے کم تر کسی شخص پر سمجھوتہ نہ کر
 سکے گی اور اس کی ساری زندگی ذہنی انتشار کا شکار ہو کر گزرے گی اور یہ سب از خود کہنے اور اس کا
 سامنا کرنے کی ہمت تم میں نہیں ہے اس لئے تم نے خوب سوچ سمجھ کر ایسے شخص کا انتخاب کیا جو خود
 بھی اسی معصوم سے محبت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ تم نے سوچا ہو گا کہ میں یہ سب کچھ سن کر خوشی سے کھل
 اٹھوں گا اور اسے قسمت کی مہربانی سمجھ کر نہ صرف تمہارا شکر یہ ادا کروں گا بلکہ اس کا ذہنی و جذباتی
 بہار اپنے کا وعدہ بھی کر لوں گا۔ کیا میں ٹھیک نہیں سمجھا مسٹر صفدر؟“

"چلو اگر ساری بات اسی طرح سے ہے بھی تو کیا تمہیں یہ سب سننا پسند ہے؟"

جے نے کہنا: "سکندر یہ سب کچھ سنگرم نارمانیوں کا عذاب تھا جسے ختم ہونا محسوس نہیں ہو"۔ اس نے
راستے کا ٹھکانا تارکچہ کرشمہ میں خوشی نہیں ہوئی؟"

"کیوں اس بند کرد اور گاڑی روک دو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "انسور مناسد۔"

کہ میں تمہاری جیسی پرکھنے والی دوسرے معنوں میں تاجرانہ ذہنیت نہیں رکھتا میں خود سے ادا ہے۔
لوگوں کی خواہشات اور جذبات کا احترام کرنا جانتا ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر اترنے لگا۔

"سکندر صاحب! جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا میں نے کہہ ڈالا۔ میں اب فدا یاب سے بھی

بھی کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ ہفتہ بھر بعد میری شادی ہے اور شادی کے تیسرے روز میں نئی عورت
کے لئے باہر چلا جاؤں گا۔ اگر تم اس سے انجی بھی محبت کرتے ہو تو اسے انتظار اور امید بیکار
تکلیف دہ کیفیت سے بچانے کے لئے یہ سب کچھ اسی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔"

سکندر نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کے سرخ و سپید خوبصورت چہرے پر ڈالی۔

"یہ لیتے جاؤ۔" سکندر نے اس کے تاثرات کی پرواہ کئے بغیر ایک نثری اسکرپٹ

بڑھایا۔ "میں جب ہاسٹل میں رہتا تھا تو وہ مجھے خط لکھتی تھیں۔ یہ اس کے محبت نامے تھے۔ یہ بنا
اور نہ شادی کے بعد لڑکیاں غموں میں اپنے باپ کی ایسی غلطیوں سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ یہ فضا بڑھ
اپنے ہاتھوں سے تلف کر دے گی تو اسے آئندہ زندگی میں کسی قسم کے خدشات نہیں متانیں گے۔ تم

تو خیر بہت بہترین شخص ہو لیکن ہو سکتا ہے اب بھی وہ تم سے شادی نہ کرے۔"

سکندر نے خاموشی سے لفافہ ہٹا کر گاڑی سے اتر گیا۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

طویل راتوں میں تو بھی قرار نہ ترے

ترن تیرے کسی غم گسار کو ترے

خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترے

کوئی جبیں نہ ترے سنگ آستان پہ نیست

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

”یا اور! جن سے عشق کیا جائے انہیں معسولی ہی تکلیف دینا بھی پس سہرا طے
 سے نذر جانے کے برابر لگتا ہے۔ پھر یہ اتنا بڑا دکھ اتنی شدید اذیت میں
 اسے کس طرح تے دوں؟ کیسے کہوں اس بیمار محبت سے کہ اس کے
 پر فریب چارہ ساز اسے چھوڑ گئے ہیں اور اس کے ارد گرد ہجر اور تنہائی کا
 صحرا پھیلا ہوا ہے۔ میں خود کو نخل سایہ دار کیسے سمجھوں یا اور۔ یہ اعتبار تو
 دوسرے دیا کرتے ہیں۔ اتنا معتبر تو محبتیں کیا کرتی ہیں۔ میں نخل سایہ دار
 بن بھی سکوں تو اس کی نظریں تو ہمیشہ سراپوں کی تلاش میں بھٹکیں گی۔
 بہت کڑا وقت دل پر آن پڑا ہے۔ بتاؤ یا اور! میں کیا کروں؟“

”سنو عند لیب! ہر دستک پر چبکنا چھوڑ دو۔ تمہیں جس کا انتظار ہے اس کی راہیں کہیں
 مخالف سمت کو جاتی ہیں۔“

جوتے پہنے ہوئے وہ بڑی آہستگی سے اپنی بات کہہ گیا تھا اور وہ جو نوالہ ہاتھ میں
 تھا اسے یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ باہر کون آیا ہے اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔
 ”کیا؟ کیا کہا تم نے؟“ اس نے نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

سکندر نے سڑکرا سے دیکھا۔ زرد کاشن کے گلچے کپڑوں میں بکھری بکھری اور منتشر سی
 ٹنگ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں کا جل تھا نہ بال ہنے ہوئے تھے۔ اس کا وہ ادھورا روپ پوری طاقت
 سے اس کے حواسوں پر حملہ آور ہوا۔

بے چینی سے رخ موڑ کر وہ جوتے پہنے لگا۔

”سنو سکندر! کیا کہا تمہارا تم نے؟“ اس نے بڑے تند لہجے میں پوچھا تھا۔

”عند لیب! ہفتہ نمبر پہلے مجھے مسند صاحب ملے تھے۔“ اس نے آخر کار اسے بتا دینے
 کا تہیہ کر لیا۔

وہ اسے اس حالت انتظار میں دیکھ دیکھ کر خود بھی ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اس کا پاگل پن
 کی حد تک بے قرار رہنا اسے بھی بے قرار رکھتا تھا سو اس نے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
 ”مسند مسند تمہیں ملے تھے۔ کیوں؟ کیا کہہ رہے تھے تم نے مجھے بتایا کہ میں
 نہیں“ ”او جیسے پخت پڑی۔“ تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی پریشان ہوں۔ پھر بھی تم پھپھاتے

رہے کیوں؟“

”سندلیب! اس شخص کی خاطر پریشان ہونا چھوڑ دو۔ کل اس کی شادی تھی آج اس

کا دلیمہ ہے اور کل وہ اپنی بیوی کے ساتھ جہاز میں بیٹھا ہنی سون کے لئے فلائی کر رہا ہوگا۔“

”تھوٹ..... بکو اس بکتے ہو تم!“ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”صفر ایسے نہیں ہیں۔ وہ

ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ ایسا کرتے تو کیا میں لاعلم رہتی اور تم ان کے اتنے قریب کیسے ہو گئے کہ یہ

سب کچھ وہ تمہیں بتائیں اور مجھ سے چھپائیں۔ نہیں سکندر۔ تم محض اپنے نمبر بڑھا رہے ہو۔ تمہیں

سچ کچھ اور دیا گیا اور تم نے اسے مرضی سے توڑ مروڑ دیا ہے۔ مجھے سچ بتاؤ انہوں نے تمہیں مجھ

سے کیا کہنے کے لئے کہا تھا؟“

”ہونہہ..... تمہارا یقین کروں۔ سر کر بھی نہیں۔ تمہارے جیسے لوگ تو اپنی خواہشات کی

تکمیل کے لئے نجانے کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔“

”عندلیب!“ اس کے دماغ کی ساری رگیں تن گئیں۔

”مت او میرا نام۔“ وہ جھٹکے سے اٹھی۔ ”میں خود معلومات کروں گی اور اگر تم جھوٹے

نکلے تو میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“

دل و جان کی تمام تر شگستگی کے ساتھ وہ بیٹھا رہ گیا۔ وہ چاہتا تو اس کے خطوط اس کے

منہ پر مار کر اپنی بات کا ثبوت پیش کر سکتا تھا۔ لیکن وہ خط جو بڑی محبتوں بڑے ارمانوں سے تحریر

کئے گئے تھے اور جنہیں پڑھنے کی بددیانتی اس نے دل کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہو کر کی تھی ان خطوط

کو وہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ حفاظت سے سینت سینت کر۔ متاع حیات کی طرح سینے سے لگا کر

وہ تا عمر ان خطوط کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ عندلیب کے الفاظ تھے۔ اس کی سوچیں اس کے

احساسات اس کے کومل جذبے تھے۔ جس پتھر کے دیوتا کو وہ بھیئت چڑھائے گئے تھے اس نے تو

حقارت سے انہیں ٹھوکر مار کر اپنے استھان سے گرا دیا تھا۔ وہ پجارن کا پجاری تھا۔ اس نے چپکے

سے محبتوں کے وہ کومل پھول اپنے دامن میں اس طرح بھر لئے تھے کہ نہ دیوتا کو ہی خبر ہوئی نہ

پجارن کو ہر چند کہ وہ پھول اور ان کی خوشبو اس کے لئے نہ تھی لیکن انہیں محسوس کرتے رہنے کا

احساس ہی اس کے لئے بہت تھا۔

”بی بی صاحبہ اندر بلارہی ہیں۔“
ملازمہ نے اسے اطلاع دی تھی۔ اس نے کیپ سر پر ہتائی اور اٹھ کر اندر کی طرف چل

دیا۔

پچھلے کئی دن سے ثانیہ کہیں جانے کے لئے نہیں نکلی تھی۔ وہ صبح سے شام تک بیٹھا رہتا اور ڈیوٹی نام ختم ہو جانے کے بعد گھر چلا جاتا۔ حیات خان صاحب بیردن ملک گئے ہوئے تھے اور ملازمہ کے مطابق ثانیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سو کچھ دنوں سے وہ قطعاً نارغ رہتا تھا۔
ملازمہ ڈرائنگ روم کے بجائے اسے اندرونی حصے میں لے گئی اور کارڈر کے انتہائی سرے پر واقع کمرے کے بند دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ سکندر۔“ اس کی آواز آئی تھی۔ ”دردازہ کھلا ہے۔“ اس نے پریشانی سے ملازمہ کو دیکھا۔

”یہ بی بی کا کمرہ ہے۔ وہ بلارہی ہیں تو تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ لیکن احتیاط سے ان کی حالت کچھ ٹھیک نہیں۔“

وہ سرگوشیوں میں بات مکمل کرنے کے پلٹ گئی۔ وہ دُرتے دُرتے اندر داخل ہوا۔ وہ ثواب گاہ تھی کہ خواہشوں کا طلسم کدہ۔ اس قدر حسین اتنی پر فسوں۔ وہ مسکلم ہو کر رہ گیا۔
مرصع چمپیر کھٹ، قیمتی پردے، نرم و گداز قالین چاروں جانب آئینوں میں نظر آتے عکس در عکس اور اس سے ٹکرا کر کمرے میں بکھرتی روشنیاں اسے چکر سا آ گیا۔

”سکندر.....“

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا وہ صوفے سے ٹیک لگا کر نیچے قالین پر تقریباً نیم دراز تھی۔ وائٹ ٹائٹ میں ملبوس وہ زرد رو اور دہنی خلیجان کا شکار لگانے کے باوجود خوبصورت لگتی تھی۔ اس کے چمک دار بال اس کے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

”ثنانیہ بی بی! آپ نے یہاں کیوں بلایا ہے مجھے؟“ اس نے رسائیت سے پوچھا۔
”کیوں..... کیا تم میرے دوست نہیں۔ آؤ یہاں بیٹھو۔“

”میں آپ کا ڈرائیور ہوں!“ وہ اس کے انداز پر پریشان ہوا تھا۔
”ارے دفع کر دیار۔ ایک تو تم چھوٹے لوگوں کو یہ درجات کے بڑے کچلیکسز

ہوتے ہیں۔

”نہیں میں کچھ غلط کہہ گئی۔“ پھر وہ زور سے ہنسی۔ ”درجات کے کمپلیکسز تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں۔ میرے باپ سے ملے ہوناں تم! کتنے بڑے آدمی ہیں کتنے بڑے دس بارہ فٹ کے تو ہوں گے ہی ہیں ناں؟“

وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ سر جھکائے ساکت کھڑا رہا۔ ان حالات میں اسے کیا کرنا تھا۔ اسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔

”اچھا سنو! یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ پلیز پلیز سکندر! فارماں سیک!“

وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اس سے قدرے فاصلے پر جا بیٹھا۔

”اوہ! شاید تم سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوں جنونی ہوں۔ میں سب کچھ ہوں لیکن یقین کرو! خطرناک نہیں ہوں۔“ وہ کھٹکھٹا کر ہنسی۔

”ثانیہ بی بی! چائے میں آپ کو گھمااؤں۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔“

”اب طبیعت بڑی ہو گئی ہے۔ اب وہ بی کھلونوں سے نہیں بہلتی۔“ وہ ہنسی۔ ”اچھا سنو! تم یہاں سے جانا چاہتے ہوناں! چلے جاؤ۔ بس ایک بار یہ بتا دو کہ اگر میں وہی لڑکی ہوں تو تم اظہار محبت کیسے کرتے۔“

اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور حلق خشک ہو گیا۔

”ڈر دمست۔ میں ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔“

”ثانی بی بی! ہوش میں آئیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ارے ارے کہاں چل دیئے۔ چند الفاظ ہی تو ہیں جو کہنے سے ڈر رہے ہو۔ ایک لمحے کو تصور کر لو کہ میں وہی لڑکی ہوں تمہاری من پسند۔“

وہ مڑا اور تیزی سے باہر جانے لگا۔

”اوہ..... اوہ بزدل ڈرپوک۔“ وہ اچانک ہی بکھر گئی۔ ”بھاگ رہے ہو۔ کیا اس سے

بھی یونہی بھاگتے ہو؟“

کرشل کا مگدان سنگی مجسمہ کشن دہا تھ میں آتی ہر چیز اسے اٹھا اٹھا کر مارنے لگی۔ وہ

تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

”اپنے صاحب کو نوری طور پر واپس بلواؤ۔“ اس نے مازمہ سے کہا تھا۔ ”تانی بی بی کی حالت بہت خراب ہے۔“

اگلے پانچ دن وہ لوٹ کر ہاں نہیں گیا۔

پانچ دن بعد وہ وہاں پہنچا تو ہر چیز نارمل تھی۔ کسی نے اس سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔ شام پانچ بجے سیاہ جینز اور بلیوٹی شرٹ میں ملبوس باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”کہاں لے چلوں بی بی؟“ اس نے گاڑی باہر نکال لی۔

”دریا کنارے!“ سنجیدگی سے جواب آیا۔

پورے راستے وہ خاموشی سے بیٹھی باہر گزرتے مناظر دیکھتی رہی۔ دریا کنارے کا منظر بڑا اداس لگتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ہر طرف اداسی بکھیر دی تھی۔

وہ باہر نکلی اور جا کر گیلی ریت پر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی کے ہونٹ سے ٹیک لگائے اس کی جانب پشت کئے کھڑا رہا۔

وہ اب جلد سے جلد یہ نوکری چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی پاگل تھا اور پاگل لوگوں سے اسے ڈر لگتا تھا اور یہ لڑکی تو اس کی سمجھ سے قطعاً باہر تھی۔

”سنو سکندر!“

بیچھے سے اس نے اسے پکارا تھا۔

وہ مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”ادھر آؤ.....“

وہ اس کے قریب آیا۔

”بیٹھو.....“

اس نے تعمیل کی۔

”جس لڑکی کو تم چاہتے ہو اس سے شادی کیوں نہیں کرتے؟“

سکندر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ابے لگا سورج اس کی آنکھوں میں کہیں ڈوب رہا

”آپ نے جسے چاہا تھا اس سے آپ کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟“ اس نے نہ جانے کیوں پہلی بار براہ راست کچھ پوچھ لیا تھا۔

اس بظاہر با اعتماد اور بولند نظر آنے والی لڑکی نے یکبارگی نگاہیں چرائی تھیں۔

”سوال کا جواب سوال نہیں دیتا۔“ پھر وہ کمزور لہجے میں بولی۔

”بعض اوقات ہوتا ہے۔“

اس نے گہرا سانس لیا۔

”اچھا! پھر میرے پاس پوچھنے کے لئے ایک اور سوال ہے۔“

سکندر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھ سے شادی کر دے گے؟“

یکبارگی اس کے سر پر کئی دھماکے ہوئے اور گرد کا منظر اس کی نظروں میں پوری طرح گھوم کر رہ گیا۔

”جج..... جی!“ پھر وہ بولا۔ ”آپ کو احساس ہے آپ نے کیا کہا ہے؟“

”ہاں! مکمل احساس ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایک بات کا یقین کر لو میں پاگل یا انکی نہیں

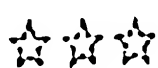
ہوں۔ میں جانتی ہوں میرا ساتھ تمہیں کوئی خوشی نہیں بخشتا لیکن اس سوال کا جواب تم پر اداوار ہے۔ چلو واپس چلیں۔“

واپسی کا سفر بھی خاموشی سے کٹا تھا۔

”تم پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔“ اترتے وقت وہ بولی تھی۔ ”اور نہ مجھ پر کوئی دباؤ یا

پابندی ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا لیکن دینا ضروری۔ مجھے تمہارا اقرار ہی نہیں انکار سن کر بھی خوشی ہوگی۔“

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ مڑی اور کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی گئی۔



دوسرے دن سے اس نے جاب چھوڑ دی۔ اس کا دماغ پہلے ہی ہر وقت الجھتا ہوا اور

پریشان رہتا تھا اور وہ خود کو مزید پریشانیوں میں الجھانے کا خواہاں ہرگز نہ تھا۔ وہ کوئی پرسکون جگہ

نوکری کرنا چاہتا تھا جہاں سے واپس آ کر وہ گہری نیند سو سکتا تھا۔ ثانیہ حیات کی ہر روز کی نئی نئی

باتیں اسے نیند اور سکون سے دور کرتی جا رہی تھیں۔ وہ اس بگڑی ہوئی امیرزادی کی پاگل پن کی باتیں سن کر اور اس کی عجیب و غریب حرکتیں سبہ سبہ کر خود بھی پاگل ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی پوری مہینہ بھر کی تنخواہ تھی۔ وہ اپنی تنخواہ لینے بھی نہ گیا۔ تین دن بعد "حیات پبلش" سے ایک ملازم آ کر اس کی تنخواہ بھی دے گیا۔ عندلیب کو دیکھ دیکھ کر اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ غالباً اسے بھی اپنے سارے پرکٹ جانے کا مکمل احساس ہو چکا تھا۔ دن بھر وہ بے دم بے جان سی چڑیا کی طرح گھر کے کسی کونے کھد رے میں پڑی نظر آتی۔ گھر والے اس سے اس کی حالت زار کی وجہ پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے لیکن اس کی خاموشی ہر سوال کا جواب ہوتی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا۔ اسے تسلی دینے کے لئے مخاطب کرنا چاہتا لیکن نجانے کیوں اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ محض اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بھرپور رات تھی۔ نہ اسے نیند آ رہی تھی اور نہ دماغ ہی کسی نقطے پر ٹھہرنے کو راضی تھا۔ وہ کافی دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر اٹھا اور چپلیس پہن کر باہر نکل آیا۔

زینے پر ہوتی روشنی نے اسے چونکا دیا۔ چچی جان بجلی کے بل سے اس قدر خائف رہا کرتی تھیں کہ کسی کورات میں زیادہ دیر تک جا گھنے کی اجازت نہ تھی۔ مبادا دیر تک بلب جلنے سے بجلی کا بل دو گنا آ جائے۔

"ستور روم میں کون ہے؟" اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔

آہستہ آہستہ میز عیاں چڑھتا وہ ستور روم کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

اندر عندلیب موجود تھی۔ گندے فرش پر ننگے پاؤں بیٹھی وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی اس کے ارد گرد صفحات بکھرے ہوئے تھے جنہیں وہ بڑی دلگیری سے اکٹھا کرتی پڑھتی اور پھر بکھیرتی جا رہی تھی۔ کافی دیر تک تو اسے سکندر کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکا۔ پھر اس نے آنسو پونچھتے ہوئے سر اٹھایا اور چند لمحوں کے لئے خوفزدہ ہو گئی۔

"تم... پھر وہ بولی۔ "تم کیا کرنے آئے ہو یہاں؟"

"یہی تو میں بھی پوچھنا چاہ رہا ہوں عندلیب!" وہ نرمی سے بولا۔ "تم اتنی رات گئے

یہاں بیٹھی کر رہی ہو؟"

"تمہیں یہ سب کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ زبردست لہجے میں بولی۔ "کیا نہیں

جانتے تم۔ سارا تماشا تو تمہارا آنکھوں دیکھا ہے اس آگ کو بچھو ہوا تو تم نے بھی دی ہے۔
 ”میں نے؟“ وہ حیرت سے منجمد ہو گیا۔ ”عندلیب! خدا کو ادا ہے میں نے اس سے
 ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لئے دعا کی ہے۔ میں تو تمہیں معمولی سی تکلیف دینے کا بھی نہیں سوچ
 سکتا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم۔“ اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ ”تم... تم میرے دشمن رہے
 ہو سدا سے میری خوشیوں کے تمہاری طلب میری خوشیاں نہیں میرا وجود رہا ہے۔ تم جلتے رہے
 صندریسے مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر جو دھند تمہاری آنکھوں میں اتری تھی کیا وہ کسی بھی آنکھ
 روکنے والے شخص سے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟ جب تمہاری آنکھوں میں اتنی دھند تھی تو تمہارا دل کس
 قدر سیلا ہوگا۔ پھر تم کیسے دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم میری خوشیوں کے لئے دعا گورہے؟ تم جلتے رہتے
 سلگتے رہے اور تمہاری جلن تمہارا حسد مالا آخر مجھے تباہ کر گیا۔ اب تو خوش ہونا تم؟ اب تو ٹھنڈ پڑ گئی
 ہوگی تمہارے جسم و جان میں۔ اب قرار مل گیا ہوگا تمہاری بے قرار یوں کو۔“
 ”عندلیب!“

”مت لو میرا نام۔ نفرت کرتی ہوں میں تم سے۔ کھیا گیا تمہارا حسد میرے نصیب آؤ
 تمہیں دیکھتی ہوں تو آنکھیں جانے لگتی ہیں میری۔ میرے قریب سے گزرتے ہو تو رداں رداں
 زہریلا ہو جاتا ہے۔“

”عندلیب! تم..... تم..... کیا کہہ رہی ہو؟“ دل اس قدر شدت سے دکھا کہ اس کی
 آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں..... مجھے یقین ہے پورا یقین ہے صندریسے مجھ سے بدل
 کرنے میں بھی تمہارا کچھ نہ کچھ ہاتھ رہا ہوگا۔ وہ تم سے ملا تھا تم نے نجانے کس طرح سے اس کے
 کان بھرے ہوں گے۔ جو اس نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔ شاید تمہارا خیال یہ ہو کہ اتنی بڑی
 چوٹ کھانے کے بعد میں تمہاری جھوٹی ہمدردیوں اور سیحانی کے قریب میں آ کر پکے ہوئے پھل
 کی طرح تمہاری گود میں آ کر دوں گی۔ لیکن کان کھول کر سن لو میں مرنا پسند کروں گی! نسبت تم سے
 کوئی تعلق قائم کرنے کے۔ میں شدید نفرت کرتی ہوں تم سے۔ نجانے خدا نے کیوں تمہیں ہمارے
 سردوں پر مسلط کر دیا ہے تم کہیں تلے جاؤ کیوں نہیں جاتے تم مر کیوں نہیں جاتے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا تھا۔ شدت غم سے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ یہ الفاظ یکجہاں دے دیے۔ تھے اس کی سماعتیں درد کی آخری حدود سے گزر رہی تھیں۔ دل سے جیسے گرم گرم لہو پھوٹ کر اس کے سارے جسم میں بھر رہا تھا۔ اتنی نفرت، اتنا شہر اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

وہ ایسا لمحہ تھا جب وہ ضبط کی تمام حدود کو پار کر گیا۔ اس کی قوت برداشت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں منقود ہو گئیں۔

وہ مڑا، زینہ اتر کر نیچے آیا اور بیردنی دروازہ کھول کر گلی میں دوڑنا شروع کر دیا۔ نجانے وہ کتنی دیر تک دوڑتا رہا تھا۔ جب اس کی ٹانگوں کی ساری طاقت، جسم کی تمام توانائیاں ختم ہو گئیں تب وہ رکا۔

وہ ”حیات پلس“ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

کال بیل کا بٹن دبائے رکھنے پر چوکیدار نے آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا کر منہ باہر نکالا۔

تھا۔

”ٹا..... ثانیہ بی بی کو جگاؤ۔“ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ ”مجھے ان سے فوراً ملنا ہے۔“

کچھ دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”ثانیہ بی بی! آپ نے ایک سوال کیا تھا۔ جس کا جواب مجھ پر ادھار تھا۔“

سفید ٹائلی میں ملبوس گلابی آنکھیں اس پر جمائے وہ بڑی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تھی۔

”مجھے آپ کا وہ پوچھنا قبول ہے۔“ وہ کسی تھکے ہوئے سب کچھ ہارے ہوئے

جواہری کی طرح صوفے پر گر پڑا۔

☆☆☆

پورا کمرہ گلابوں کی مہک سے بھرا ہوا تھا اور اس مہک کے درمیان اپنا مہکتا وجود لئے وہ

اس کے مقابل تھی لیکن سکندر بخت کا تصور کہیں اور بٹک رہا تھا۔

”سکندر!“ اس نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ”اتنا مت سوچو ورنہ میری طرح

پاگل کہلاؤ گے۔“

”ثانیہ! ایک بات بتائیں۔“ اس نے کہیں بھنگی: دلی نگاہیں اس کے چہرے پر جمائیں۔

”جی ہاں کہ یہ فیملی میں نے کیوں کیا تھا؟“ وہ ہنسی۔

”جی ہاں۔ یہی پوچھنا چاہتا ہوں میں!“

”میں نے سوچا سکندر۔ شاید دودا دھورے د جو دل کر ایک مکمل بھڑپور د جو د بن سکے۔“ وہ کچھ سوچ کر افسردہ ہوئی۔

”کس کو چاہتی تھیں آپ؟“

ثانیہ نے گلابوں پر سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر جمائیں۔

”میرا کلاس فیلا تھا۔“

پھر ایک انظر اب کے عالم میں وہ اٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور وہ کتھار کس چاہتا تھا۔ اپنا بھی اور اس کا بھی۔ سودا اٹھا اور اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

”کیسا تمنا وہ؟“ بڑی آہستگی اور نرمی سے اس نے پوچھا تھا۔

”بہت اچھا بہت نیک بہت شریف۔ دودنیا کا سب سے خوبصورت انسان تھا۔“ اس کی آواز بیگی ہوئی تھی۔

”میں ایک بگڑی ہوئی امیرزادی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ انسان کیسا ہونا چاہئے۔“

اس نے مجھے انسان کی عزت کرنا سکھائی، چھوٹے بڑے کو ایک نظر سے دیکھنا سکھایا۔ وہ ایک کلرک کا بیٹا تھا اور ان کے گھر میں دودقت کی روٹی، خجی، بڑی دقتوں سے کمائی اور کھائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اس نے میرے باپ کی دولت سے مرعوب ہو کر مجھے سجدہ کیا اور نہ میرے حسن نے اس کا ایمان ایک لمبے کے لئے بھی کمزور کیا۔ وہ ناقابل تسخیر تھا۔ اس کے حوصلے ناقابل شکست تھے۔ بہت اچھا بہت عظیم تھا وہ۔“

”پھر شادی کیوں نہ کی اس سے؟“

”اسی لئے کہ اس دقت مجھے دماغی دورے نہیں پڑتے تھے اور اس لئے کہ اس دقت

میرے لئے دذیروں اور جاگیرداروں کے بیٹوں کے رشتے موجود تھے اور اس لئے کہ اس دقت میرے باپ نے جملنا نہیں سیکھا تھا۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”وہ چاہتا تو مجھے بھگالے جاتا اور اسے

بھری محفل میں ذلیل کرنے والے میرے باپ سے بھرپور انتقام لے لیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے میرے باپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی کزن سے شادی کر لی۔

”تب سے یہ دورے پڑنے لگے؟“

وہ اس کی جانب دیکھ کر استہزائیہ ہنس دی۔

”دورے! نہیں سکندر! مجھے دوڑے نہیں پڑتے۔ میں پاگل ہوں نہ دماغی مریض کیونکہ دماغی مریض کو تو شور مچاتے ہوئے چیزیں توڑتے ہوئے احساس نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟“

”اور آپ کو احساس ہوتا ہے؟“ اس نے غایت درجہ کی حیرت سے پوچھا۔

”آپ..... آپ جان بوجھ کر کرتی رہیں یہ سب کچھ؟“

”ہاں..... ہاں سکندر۔ اس دنیا کے خلاف اتنا زہر بھر گیا تھا میرے اندر کہ اسے نکالنے

کا یہ ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا میرے پاس۔ جب ڈیڈی میری وجہ سے پریشان پھرتے ڈاکٹر زکی لائن لگا دیتے بیرون ملک دورے کرتے تو میری روح بہت ہلکی ہو کر کھلی فضا میں پرواز کرتی۔ ٹھیک ہے ایک محاذ پر ڈیڈی نے مجھے شکست دے دی کہ میرے اپنے حلیف ان کے طرفدار ہو گئے تھے۔ لیکن سکندر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر شادی کی کسی کو اپنا بنایا تو وہ شخص میرے ہی معیار کا ہوگا۔ ڈیڈی کے معیار کا نہیں اور دیکھو یہ جنگ میں جیت گئی۔“ اس کی شناف آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”میں جانتی ہوں میں جانتی ہوں کہ یہ شادی محض ایک سمجھوتہ ہے تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔ نہ میں عارفین کو بھول پاؤں گی اور نہ تم اس بیرہوئی کو۔ لیکن یہ ایک بہتر راستہ ہے۔ دو غموں کے ہارے افراد ایک دوسرے کا سہارا بن کر جی سکتے ہیں۔ زندگی کی کنھن پر خار راہ کچھ آسان ہو سکتی ہے۔“

میں جانتی ہوں میں کبھی بھی تمہارے لئے اس کا لقمہ البدل نہیں بن پاؤں گی۔ تم میری آنکھوں میں اس کی آنکھیں میری باتوں میں اس کے لفظوں کو کھو جو گے لیکن میں کوشش کروں گی کہ اس تلاش میں تم تشنہ نہ رہ جاؤ۔ آج سے قبل مجھے کبھی بھی تم سے محبت کا دعویٰ نہیں رہا کہ تمہاری طرف بڑھنے کی واحد وجہ عارفین کی وہ شبیہ تھی جو تمہاری ایک ایک ادا سے جہلکتی تھی لیکن آج کے بعد میں تم سے محبت کروں گی اس رشتے سے محبت کروں گی جو میرے اور تمہارے بیچ بنا ہے اور تم

بھی کوشش کرنا کہ ایسا کر سکا۔“

اس کے سو جانے کے بعد سگریٹ ساگا کر وہ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔

نفرت کا ایک الاؤ تھا جو اس کے سینے میں دکھاتا تھا۔ ایک سوچ تھی جو نفرت کی آگ سے جھلس کر ہر باد بن گئی تھی اور اب اس کی رگ رگ میں زیر و زدا تھا۔

زندگی بھر کا ناسور بن گئے تھے وہ الفاظ:

”میں شدید نفرت کرتی ہوں تم سے۔۔۔ نجانے خدا نے کیوں تمہیں ہمارے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔ تم کہیں چلے کیوں نہیں جاتے تم مر کیوں نہیں جاتے۔“

اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا۔ کانوں سے دھواں نکلنے لگتا۔

”یاد رہے! تم سے ایک دعا مانگنے کی درخواست کی تھی نجانے تم نے مانگی یا نہیں لیکن یاد میری وہ دعا از خود قبول ہو گئی ہے۔ میں میں زندگی کے آخری موڑ پر بھی اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ اس نے میری نہیں میری محبتوں کی توہین کی ہے۔ مار ڈالا ہے اس نے میری چاہتوں کو خون کر دیا ہے اس نے میری دغاؤں کا۔ میں میں نفرت کرتا ہوں اس سے اسی کی طرح۔ شدید نفرت!“

☆ ☆ ☆

”سکندر! یہ کیا ہوا؟“ عرصے بعد اس سے مل کر وہ حیران تھا۔ ”تیرا خط تو ساری

مضروفیات چھوڑ کر میں دوڑا چلا آیا۔ یہ یہ سب کیا ہے؟“

”میں نے لکھا تھا نانا یاد رہے! یہ سب نفرت ہے میرے ارد گرد اس کی نفرتیں بکھری ہوئی ہیں

اور میرے اندر میری نفرتیں بکھری ہوئی ہیں۔“

”نہیں سکندر نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے تو اسے قدر چاہتا تھا عبادت کرتا تھا اس کے

تصور کی۔ پھر پھر یہ کایا پلٹ کیسے؟“

یاد رہے! ”وہ رد دیا۔“ اس نے مجھے نہیں میری محبتوں کو ذلیل کیا پامال کر دیا میری

تقدیر توں کو قدموں تلے کچل دیا میری نیاز مند یوں کو۔ یاد رہے! کسی کی عزت نفس ایک بہت بڑی

حقیقت رکھتی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر کے ایسی ٹھوکر لگائی میری رہی تھی انا کو کہ اب تک اپنے وجود کے ریزے ریزے مجھے ہواؤں میں بکھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ تھا۔ نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ اب جاؤ اور ان سے ملو تو کہہ دینا کہ وہ سکندر بخت جو ذلیل تھا 'حقیر تھا' بے قیمت تھا وہ سکندر بخت اب اتنی اونچی جگہ کھڑا ہے کہ اسے دیکھنے کی کوشش میں ان کی گردنیں ٹوٹ جائیں گی۔ چچی نے ملو تو انہیں بتانا کہ پانچ ہزار روپے ماہوار کمانے والا وہ ڈرائیور آج پانچ لاکھ روپے ماہوار کما رہا ہے۔"

"سکندر!" یاد رکھو افسوس ہوا۔ "یہ باتیں 'یہ ذہنی سطح' یہ تیرا تو شیوہ نہ تھا۔"

"مر گیا ہے وہ سکندر فنا ہو گیا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "اس سکندر کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ آج کا سکندر شہر کے سب سے امیر ترین شخص کا داماد ہے اور اس کے کاروبار کو دن دو گنی رات چو گنی ترقی دے رہا ہے اور اس کی بیوی حسن و جمال میں انداز نشست و برخاست میں بے مثال ہے۔ وہ جاہلی لڑکی اس کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "مجھتیں وقتی طور پر دل و دماغ کی جنگ میں کہیں بھول بھلیوں میں غم ضرور ہو جایا کرتی ہیں لیکن مرتیں نہیں۔ تم مرتے دم تک اسی جاہل لڑکی سے محبت کرتے رہو گے۔"

"میں اس سے نفرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ اپنے دل میں نہیں پاتا یاد رکھو۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "خدا نخواستہ کہیں اس سے ٹکراؤ ہو گیا تو اسے بتاؤں گا ضرور اور میری خواہش ہے کہ یہ ٹکراؤ مرتے دم تک نہ ہو۔"

یاد رہے اسے ہنس دیا۔

"میں بہت مصروف ہو گیا ہوں یاد رکھو۔ نجانے اگلے چند سال مجھ میں مزید کیا تبدیلیاں لائیں لیکن دوست ملتے رہنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں کسی عزیز دوست کے مرجانے کا دکھ تھا اور کاندھے اس کے ناپیدہ جنازے کے بوجھ سے ہٹکے ہوئے تھے۔ وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل گیا۔

زندگی اس طرح سے اپنے محور پر رواں ہوئی تھی کہ وہ خود کو بھی بھول گیا تھا۔ اس میں

کتنی سلامتیوں چھپی ہوئی تھیں اسے خود کو خبر ہوتی تو وہ چند لمحوں کے لئے حیران رہ جایا کرتا تھا۔
 حیات خان صاحب تک بھول چکے تھے کہ وہ کیا تھے اور کس طرح سے ان کی اکلوتی بیٹی کی زندگی
 میں داخل ہوا تھا۔ سکندر کو شادی سے پہلے کے ان کے الفاظ یاد تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

”میں نہیں جانتا کہ یہ تمہاری اپنی پائنگ کا نتیجہ ہے یا محض تمہاری خوش
 قسمتی، لیکن بہر حال یہ ملے ہے کہ تم میرے داماد بننے جا رہے ہو۔ اپنی بیٹی
 کے متعلق میں تمہیں پہلے ہی تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ اگر تم بے پناہ دولت
 مند بننے کے شوق میں ایک ہنونی پانگل لڑکی کے ساتھ ساری زندگی گزار
 سکتے ہو تو تمہاری مرضی۔ میں تو اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں اور
 مجھے یقین ہے وہ نارمل نہیں ہو سکتی اور چونکہ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے
 میری اکلوتی وارث ہے اس لئے اس کی اس حالت کے پیش نظر اس کی ہر
 بات کو مان لینا میری مجبوری ہے اور میں تمہیں تمام تر ناپسندیدگی کے
 باوجود اپنا داماد بنا رہا ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر تک اسے ماسف سے دیکھتے
 رہے تھے۔ ”بڑی خواہش تھی میری کہ میرا ایک دلیل ایجوکیٹڈ، ٹیلنٹڈ، باہمی
 اسٹینس سے تعلق رکھنے والا ہو جس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کو رخصت
 کرتے ہوئے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ یہ ٹائڈ آئی ایڈمٹ۔ تدبیر
 کبھی کبھی تقدیر کے سورج کے سامنے ایک ذرے کی بھی حیثیت نہیں
 رکھتی۔ اس سے تو بہتر تھا آج سے کچھ برس پیشتر میں نے یہ بات تسلیم کر
 لی ہوتی۔ کم از کم وہ نارمل تو ہوتی۔“

اور آج حیات خان صاحب اپنی کہی بات بھول کر بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا
 کرتے لوگوں سے اس کا تعارف اپنے داماد کی حیثیت سے کراتے ہوئے ان کے چہرے پر بڑی
 خوبصورت چمک ہوتی کہ وہ ان کے لئے درحقیقت سکندر بخت ثابت ہوا تھا۔ ان کی اکلوتی لاڈلی
 بیٹی اس سے وابستہ ہو کر بالکل نارمل ہو چکی تھی اور ایک بہترین ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ ان کا
 کاروبار ترقی کی شاہراہ پر تیز روی سے گامزن تھا اور ان کی ایک بے حد پیاری انہیں تو کلی زبان
 میں ”نانا جان“ کہنے والی نواسی ان سے اپنے سارے لاڈ پورے کرانے کے لئے دنیا میں آگئی

تمہی۔

☆ ☆ ☆

بچھلے ماہِ ثانیہ اور رانیہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کے ٹور سے لوٹا تھا۔ ثانیہ صحت مند ہو کر مزید دلکش ہو گئی تھی اور رانیہ نے اب بالکل صاف زبان میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

”سکندر!“ رانیہ کو اب سکول کی ضرورت ہے..... ہے ناں۔“ ثانیہ اسے دلیہ کھلا رہی تھی۔

”نہیں ثانی..... بچوں کو چند سال تو بالکل بچہ بن کر جی لینے دیں۔ ابھی سے ان پر کاپیوں، کتابوں اور بستوں کا بوجھ نہ ڈالیں۔“

اس نے جھک کر رانیہ کا گال چوما۔

”یہ بگڑتی جا رہی ہے۔ ڈیڈی اور تم نے مل کر اسے بہت سرچڑھالیا ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں مانتی یہ.....“

”دیکھیں۔ میری پیاری بیٹی کو کچھ مت کہا کریں۔ جب ہم سب مل کر اسے پیار کرتے ہیں اس کی شرارتوں پر ہنستے ہیں اس کی فرمائشیں پوری کرتے ہیں تو مجھے ایک خاص ذہنی سکون محسوس ہوتا ہے بچوں سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان کا بچپن ان سے چھین لینا بہت بڑی نا انسانی ہے۔“

”لیکن بچوں کو تمیز سکھانی بھی ضروری ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”بے جالا ذکر کے انہیں معاشرے کا ناکارہ اور ناپسندیدہ فرد بنانا کہاں کا انصاف ہے؟“

”اس کے لئے گورنس رکھ دیں۔ لیکن فی الحال سکول نہیں۔“ اس نے فیصلہ سنایا اور ہاتھ دھونے کے لئے اٹھ گیا۔

ثانیہ کا دور کا کوئی کزن ان کے یہاں چند ماہ سے مقیم تھا۔ وہ دن بھر رانیہ کو اٹھائے بھرتا۔

”جی..... گورنس کی ضرورت نہیں۔ میں جب تک یہاں ہوں اسے میری بیٹی سمجھ لیں۔ ہم اسے آپ کو تنگ نہیں کرنے دیں گے۔“

”بہت چالاک ہے میری بیٹی!“ ثانیہ بھی مسکرا دی۔

”ہر کسی کو اس نے اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ پھر بھلا اس شکار خانے میں میری آواز کس نے سنی ہے۔“

”درست کہتی ہیں آپ!“ اس نے مسکرا کر اسے ہوا میں اچھالا اور باہر لے گیا۔
 ”سکندر! اشتہار دے دو اخبار میں گورنس کے لئے۔ میں ذاتی اس کی طرف سے
 فکر مند ہوں۔“

”ڈنٹ وری۔“ وہ بریف کیس بند کر کے مسکرایا۔ ”ہمایوں رانسی تو ہو گیا ہے اس کام
 کے لئے۔ آپ اپنے کزن سے ہی تنخواہ وغیرہ طے کر لیں۔“
 ”سکندر! پلیز! بی سیر لیں!“

”او۔ کے ڈیئر۔“ وہ اس کا گال تھپتھا کر باہر نکل گیا۔
 برسوں بعد وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ سکندر نے اگر چشمہ نہ لگا رکھا ہوتا تو یقیناً اسے
 پہچاننے میں دشواری محسوس کرتا۔

”کیسے ہو یادور۔“ وہ گرجوٹی سے بغل گیر ہوا تھا۔
 ”فضل ہے خدا کا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہارا حال نہیں پوچھوں گا۔ ایک ایک ادا سے عیاں
 ہے۔“ وہ تہتہ مار کر ہنس دیا۔ پھر اس نے اپنی سیکرٹری کو کافی لانے کا آرڈر دیا اور دونوں ہر کام بھلا
 کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نجانے کتنی یادیں تھیں جو وقت کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔
 انہیں کرید کرید کر نکالنے میں انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

”سکندر.....“ اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے بتاتے وہ اچانک بولا تھا۔ ”بچھلے
 سال تمہارے چچا میاں کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”اوہ.....“ وہ چند لمحوں کے لئے سن ہو گیا۔

”تمہارے گھر والے بڑی کسیری کے عالم میں ہیں۔“

”میرے گھر والے؟“ وہ تلخی سے بولا۔ ”خدا انہیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ

رکھے۔ میری بیوی، میری بچی، یہی میری متاع حیات ہے۔“

”ٹھیک!“ یاد رکھیے دیر کو خاموش ہو گیا۔ ”تم نے دائمی خوشی کا فارمولا ڈھونڈ لیا ہے۔“

پرانی گزری باتوں کو فراموش کر دینا خوش رہتا ہے انسان۔ ویسے تمہاری چچی تمہیں اکثر یاد کرتی

ہیں۔ آصف اور داحف کی نااہلی اور نا لائقیت کو دیکھ کر تم انہیں شدت سے یاد آتے ہو۔“
نجانے وہ سخت افسردہ ہوا تھا یا یہ بات اسے خوشی بخش گئی تھی۔ اسے خود اپنی کیفیت سمجھ
میں نہ آئی۔

”تمہاری کزن مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اسے کوئی چھوٹی موٹی نوکری دلا دوں تاکہ ان
کے گھر کا خرچہ چل سکے۔“

”یاد رہے! چیخ دانا پک۔“

”او۔ کے۔“ وہ دوسری باتیں کرنے لگا۔

لیکن اس کی دوسری باتیں بھی سکندر کا دھیان اس کی پہلی باتوں کی طرف سے نہ ہٹا
سکیں۔

”میں بہت مادیت پسند لڑکی ہوں۔ فی الوقت متوسط طبقے سے تعلق ضرور
رکھتی ہوں لیکن آئندہ زندگی اس سے برتر طبقہ میں گزارنا چاہتی ہوں۔
اس سے مزید نیچے آنا میرے لئے ناممکن ہے۔“

بچے لمحوں کے چند سائے اس کی آنکھوں کے سامنے اہرا گئے۔ ایک زہر خند مسکراہٹ
نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

”غالبا تم میری بات نہیں سن رہے۔“ یاد رہنے اسے مخاطب کیا۔ ”اب تم اپنے بزنس
کے بارے میں اکیلے میں سوچو۔ میں اب چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”سنو یاد رہا!“ وہ اسے سی آف کرنے آفس کے مرکزی دروازے تک آیا۔ ”میری بیٹی
کے لئے ہمیں ایک گورنس کی ضرورت ہے۔ اسے کہنا کہ سیلری منہ مانگی مل سکتی ہے۔“ یاد رہ پتھر کا
بت بن کر اسے ذہین لگا۔

”سکندر!“ پتھر وہ بمشکل بولا۔ ”تم... تم..... چاہو تو اسے اپنے آفس میں کسی
مناسب جگہ پر رکھ سکتے ہو۔“

”میں اسے مناسب جگہ پر ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“ تلخی سے اس کا پورا وجود کڑوا ہو گیا۔
”تم چاہو تو اسے مت بتانا کہ اس بچی کا باپ کون ہے میرا اس سے سامنا ہونا زیادہ
ممکن بھی نہیں اور یوں بھی ضرورت مند لوگ ایسی باتوں کو نظر انداز ہی کر دیا کرتے ہیں۔“

”خیر! اس کی مرضی ہے وہ انکر چاہتے تو یہ جاب اس کی منتظر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے

ایک ”پتھر جاب“ کہہ کر ریجکٹ ہی کر دے۔“

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ یاد رہے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرایا اور باہر

نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

”سکندر! آج ایک لڑکی آئی تھی ’عندلیب‘!“

کافی کاکپ لبوں تک لے جاتے ہوئے وہ درمیان میں ہی رک گیا۔

”کہہ رہی تھی کسی صاحب نے گورنس کی جاب کے لئے ہمارا پتا اسے دیا تھا۔“

”یہ تو کافی پرانی بات ہے۔“ پھر وہ بے نیازی سے کافی پیئے لگا۔ ”اسے اب خیال آیا

ہے؟“

”کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں راشی نہیں تھی لیکن اب گھریلو حالات کی وجہ سے مجبور ہو گئی

ہے۔ بڑی ضرورت مند لڑکی ہے بھی بہت پیاری اور نفیس طبیعت۔ پھر بھی میں نے کہا کہ

انٹرویو میرے ہسپینڈ لیں گے۔ تم کل ذرا لیٹ آفس جانا چلیز۔ میں نے اسے نو بجے کا ہت

دیا ہے۔“

”ثانی..... ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔

”اگر آپ اس سے مطمئن ہیں تو میں بھی مطمئن ہوں اور پھر اگر وہ ضرورت مند بھی لگتی ہے تو مزید

کیا پوچھنا۔ رکھ لیجئے اور ہاں سہلری ذرا زیادہ دیجئے گا! ایڈوانس دے دیں۔“

”تم جانتے ہو اسے؟“ ثانیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”جن صاحب نے اس کی سنارٹس کی ہے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ

بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

”ہاں..... ہاں آج احساس ہوا ہے نفرت کے اس کمیل میں میں نے تمہیں بری طرح

سے شکست دی ہے مگر عندلیب احمد!“

رات کو اس نے اپنے درپے سے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

”تمہارا سارا غرور ’گمنند‘ ناز میرے قدموں تلے ہے۔ ایک معمولی ملازمہ ہو میرے

گھر میں۔ وہ تمہارے ہالی شیٹس کے خواب سب چکنا چور ہوئے۔ نجانے تمہیں یہ احساس ہے یا نہیں کہ کسی کی عزت نفس کو نہیں پہنچانا خود انسان کو کس مقام پر لاسکتا ہے۔ "سگریٹ کے گہرے کش لے کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"عندلیب احمد! رانیہ سکندر بخت کی گورنس!" وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

"ڈیڈی! آئی بہت سوٹ ہیں وہ مجھے اچھی اچھی باتیں سکھاتی ہیں۔" رانیہ نے

دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تمام کر اپنی طرف کیا۔

"اچھا۔" وہ مسکرایا۔ "مثلاً کیا سکھاتی ہیں وہ ہماری بیٹی کو۔"

"ڈیڈی! وہ کہتی ہیں سارے انسان برابر ہیں۔ ہمیں سب سے محبت کرنی چاہئے۔

ہمیں سب سے نیک برتاؤ کرنا چاہئے۔" اس نے رٹا رٹا یا سبق دہرا دیا۔

"یہ برتاؤ کیا ہوتا ہے ڈیڈی؟"

"یہ برتاؤ ہی تو سب کچھ ہوتا ہے میری جان۔" اس نے اس کی پیشانی چومی۔ "یہ

برتاؤ انسان کی عظمت اور اس کا وقار ہے۔ اس برتاؤ کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔ سمجھیں؟"

"جی.....!" اس نے سر ہلایا۔

اور وہ اس کی معصومیت پر مسکرا دیا۔

پچھلے تین ماہ سے وہ یہ نوکری کر رہی تھی اور اب تک اس نے شکایت کا معمولی سا موقع

بھی نہیں دیا تھا۔ ثانیہ اس سے بہت خوش تھی بلکہ اس نے تو اچھی خاصی دوستی بھی کر لی تھی اس سے۔

"بہت نفیس بہت شائستہ لڑکی ہے سکندر۔ کبھی تم بھی ملو ناں!"

"مجھے اتنا وقت کہاں۔ صبح جا کر رات کو لوٹا ہوں۔ کاروبار سنبھالنا، کچن سنبھالنے سے

کہیں مشکل ہے۔" ثانیہ اسے گھور کر رہ گئی۔

اس کی روح اب بہت پرسکون ہو گئی تھی۔ نفرت کے جوالاؤ دن رات بدن میں دہکا

کرتے تھے اب ان پر طمانیت کی پھوار برسا کرتی تھی۔

بہنا، یہی چاہتا تھا اس نے اس گھر سے نکلے وقت یہی مانگا تھا خدا سے کہ جو سر غرور اور تنفر

سے بنا ہوا تھا زندگی میں کبھی ایک بار وہ اسے جھکا ہوا دیکھ سکے۔ وقت نے اس کے سارے بدلے

چکا دیئے تھے۔ سارے حساب بے باقی ہو گئے تھے۔

”اور وقت سارے بدلے چکا دیتا ہے سارے حساب بے باق کرتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔“

رات کے اندھیرے میں وہ درتے چکے میں کھڑا ہو کر سوچا کرتا۔

”سکندر! ایک عجیب سی نیوز ہے۔“ وہ لندن میں تھا۔ جب ثانیہ نے اسے فون پر اطلاع دی۔

”ہاں ہاں کہیں..... میں سن رہا ہوں۔“

”اپنا ہمایوں ہے نا..... وہ عنند لیب میں انٹر سٹڈ ہے۔“ اس نے پر خاموشی چٹھا گئی۔

”سکندر..... سکندر سن رہے ہونا؟“

”آں.....“ وہ حواسوں میں لوٹا۔ ”کیا کیا کہا آپ نے؟“

”ہمایوں عنند لیب کو پسند کرنے لگا ہے۔ رانیہ کی گورنس کو۔ شادی کرنا چاہتا ہے اس سے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں آنٹی حشمت سے بات کر دوں۔“

”ثانیہ..... آپ کو اس مسئلے میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے لہجے میں سختی در آئی۔

”ہمایوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہت فرق ہے ان لوگوں کے سٹینڈس میں۔“

”سکندر۔“ ثانیہ کو حد درجہ حیرت ہوئی۔ ”سٹینڈس کا ڈیفینس تمہارے لئے بھی اہمیت

رکھتا ہے؟“

وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

”آپ طنز کر رہی ہیں؟“ پھر وہ بولا۔

”بالی گاڈ نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”نیکن مجھے تمہاری زبان سے یہ سن کر شاک لگا

ہے۔ سکندر وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ پریٹی اینڈ ٹائٹس۔ وہ ضرورت مند ضرور ہے لیکن اس کا تعلق کسی

اچھے خاندان سے لگتا ہے۔“

”ثانیہ! آپ کو اس کے خاندان تک جانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”میں

آؤں گا تو اس مسئلے پر مزید بات ہوگی۔“ اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

”یہ..... یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اسے اس مقام پر دیکھنے

کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑا ہے مجھے اور ایک بار وہ پھر میرے برابر پہنچ رہی ہے۔ ایک بار پھر وہ مجھ

سے نظریں ملا کر بات کرنے کے قابل ہو جائے یہ کیسے ممکن ہے۔ نہیں وہ اپنی اصل جگہ پر ہے۔ یہی اس کا اصل مقام ہے۔ یہاں سے ایک سٹیپ بھی وہ اوپر آ سکتے ہیں منظور نہیں۔ "وہ بے چینی

سے ہلتا رہا سوچتا رہا۔
 "ہایوں پاگل ہو رہا ہے۔ آنٹی شست کبھی نہیں مانیں گی۔ وہ سفدر کی ماں سے کچھ کم تو نہیں۔" چلتے چلتے اس کے قدم تھم گئے۔

"سفدر!"

ایک نام ذہن کی تہوں سے نکل کر نوکیلے کنکر کی طرح سوچوں کے پاؤں زخمی کرنے

لگا۔

"جاؤ عندلیب بیگم! ساری عمر اس ایک نام پر گزار دو یہی سزا ہے تمہاری۔" ہمایوں جیسے امیر دبیر خاندان کے چشم و چراغ سے شادی کر کے تم میرے ہم پلہ شخص کی بیوی بنو۔ ناممکن میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا نیور۔"

☆☆☆

"سکندر! آخر اس میں حرج کیا ہے؟" وہ زندگی میں پہلی بار اس سے ناراض ہوئی

تھی۔

"جی سکندر بھائی! مجھے بھی تو بتائیں اس مسلسل انکار کی وجہ؟" ہمایوں زچ بیٹھا تھا۔

"میں تو فون پر کسی سے بات کر چکا ہوں وہ کہتی ہیں ثانیہ اور سکندر مطمئن ہوں تو انہیں بھی اعتراض

نہیں۔ سکندر بھائی جس انکار کی توقع مجھے مئی سے تھی وہ آپ کی جانب سے کیوں ہے؟"

"دیکھو ہمایوں! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ رسانیت سے بولا۔ "جس طبقے سے اس

کا تعلق ..."

"مجھے اس سے غرض نہیں میں اس کی انوسٹنس سے اس کی پیورٹی سے متاثر ہوا ہوں۔

وہ کمال لڑکی ہے۔ اب اس کا تعلق کس طبقے سے ہے مجھے اس سے غرض نہیں۔"

"میں تمہیں یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں ہمایوں کہ جتنا انوسٹنس اور جتنا پیورتم

اسے سمجھ رہے ہو وہ سکتا ہے یہ تمہاری غلط فہمی ہو۔"

"کیا مطلب؟" فوجی دونوں ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ..." الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ خیر میں یاد رہے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ وہ اگر مطمئن ہوا تو مجھے بھی اعتراض نہ ہوگا۔" اس نے جھوٹ بول کر بات بدل دی۔

نجانے کیا بات تھی! جو کچھ وہ اس کے بارے میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں کیا۔ کس جذبے نے بے اختیار دل سے بلند ہو کر زبان کا راستہ روکا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا اور الجھ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

لیکن اندر جو کشمکش مسلسل جاری تھی اسے وہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے سامنے کاغذ اب بکھرے ہوئے تھے صفحہات ہی صفحہات جن پر وہ الفاظ تحریر تھے۔ جنہیں ایک مدت اس نے اپنی متاعِ کل سمجھ کر سینت سینت کر رکھا ہے وہ لفظ جو اس کے لئے نہ تھے پھر بھی ایک زمانے میں وہ انہیں پڑھ کر اپنی تشنہ کامیوں کو سیراب کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتا۔

یاد رہے اسے اس کا بیک لا کر دیا تھا تو اسی کے کونے کھد رے میں پڑے یہ خطوط بھی ساتھ چلے آئے تھے اور جنہیں اس نے نفرت کے لاد کو دقت بردقت بھرکانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

۱۱

مدت سے یہ خطوط اس کی الماری کی ایک دراز میں منتقل تھے۔ شاید جس روز بخشر وہ منتظر تھے وہ آنا پہنچا تھا۔

یاد رکھا نام لے کر یہ خط وہ ہمایوں کو دینا چاہتا تھا۔ اتنا بھروسہ اسے عندلیب احمد کی سچائیوں پر تھا کہ وہ کبھی بھی جھوٹ بول کر ان سے غیر وابستہ ہونے کا دعویٰ نہ کرتی۔ پھر ہمایوں جیسا انوسینس اور پیورٹی کا دلدادہ کیسے اسے مزید التفات کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔

خطوط کو سامنے رکھے وہ سوچتا رہا، مسکراتا رہا۔

"عندلیب احمد! محبتوں پر تو تمہارا ایمان لانا نہ سکے اب تمہیں یہ ضرور بتائیں گے کہ

نفرت کیسے کی جاتی ہے۔"

گاڑی میں اس نے اپنا بریف کیس کھول کر دیکھا تھا اور پھر اس کا موڈ شدید آف ہو گیا

تھا۔

"ڈرائیور! واپس گھر چلو۔" وہ بڑی ضروری فائل بھول آیا تھا۔

"بہتر سر....." ڈرائیور نے گاڑی اگلے سوڑ سے واپس موڑ لی۔

دو گھر آیا تو ثانیہ دوبارہ سونے کے لئے جا چکی تھی اس کا قاعدہ تھا کہ وہ سکندر اور رانیہ کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو کر ایک بار پھر نیند لیتی تھی۔ اس نے الماری سے فائل بریف کیس میں رکھی اور باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا جب اس سے ٹکرایا۔
عندلیب کے ہاتھوں سے کتابیں نکل کر سیڑھیوں پر بکھر گئیں۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھے تھے اور پھر وہ مجسم رہ گیا تھا۔

وہی نقش وہی ملاحتیں وہی زریاں وہی اچالے۔ سکندر پتھر کا بت بنا اس کے چہرے کو دیکر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کتابیں اکٹھی کرتی رہی۔ غالباً وہ رانیہ کے لئے لائی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ وہ چونکی تھی اور نہ گھبرائی تھی۔ گویا اسے ہمیشہ سے علم تھا کہ جس بچی کی وہ گورنس ہے اس کا باپ کون ہے۔ کتابیں اکٹھی کر کے وہ کھڑی ہوئی تو وہ بھی کسی سحر سے آزاد ہو کر آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔
”کیسے ہو سکندر؟“

وہی آواز تھی جسے سننے کے لئے وہ اس سے بلاوجہ مخاطب ہوا کرتا تھا۔
”میں.....“ وہ آگے خاموش ہو گیا۔

— وہ ہولے سے مسکرائی اور سائیڈ سے ہو کر آگے نکل گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ وہ مسکراہٹ یادوں کے کتنے باب کھول گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ایک ایک کر کے کتنے منظر گزرے پھر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

”یہ لڑکی..... جو مانند صبا ابھی پاس سے یوں گزری ہے جیسے یادوں کی معطر خوشبو ہو۔ میرا اس لڑکی سے کیا رشتہ ہے؟“ اس نے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر خود سے پوچھا تھا۔

”کیوں ہر نگاہ نے آپس کے نقش یوں چوہے جیسے برسوں بعد کوئی بھٹکا ہوا مسلم کعبہ میں جائے۔ کیوں ہر سانس نے اس کا سوا گت یوں کیا جیسے تپتے صحراؤں میں باد نسیم کا پہلا جھونکا دارد ہوا ہو۔ کیوں دل کے خالی سپ نے اس لمحے کو حدف بنا کر خود میں محفوظ کر لیا ہے۔ کیوں کیوں کیوں!“

اس نے ریٹنگ سے سر نکا دیا۔ دماغ کے کسی گوشے میں یاد کی آواز گونج رہی تھی۔
”محبتیں دقتی طور پر دل و دماغ کی جنگ میں کہیں بھول بھلیوں میں گم سرور ہو جایا کرتی ہیں لیکن مرنے نہیں۔ تم مرتے دم تک اسی لڑکی سے محبت کرتے رہو گے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ

”کیا:“ سے نفرت کرتا رہا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی بولا۔“ وہ نفرت نہیں تھی بے وقوف۔ ہر مایوں کے خواب کے۔

خلاف لاشعور کی معمولی سی مزاحمت تھی!“

”کیا رشتہ ہے میرا اس سے؟“

”محبت۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔ محبت۔“ وہ گٹھنوں پر ہاتھ رکھ کر بشکل کھڑا ہوا، روتا ہوا۔

سڑھیاں اترنے لگا۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے!

تیری مسرت پیہم تمام ہو جائے

تیری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے

غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا

ہجوم یاسی سے بے تاب ہو کے رو جائے

دُور درد سے سیماب ہو کے رو جائے

تیرا شباب فقط خواب ہو کے رو جائے

غریب حسن سراپا نیاز ہو تیرا

کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے

فریب وعدہ فریاد پہ اعتماد کرے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو تیرا انتظار اب بھی ہے

سورج کی دھلتی کرنوں سے بریا کا پانی نارنجی ہو رہا تھا اور اس ادا سے اور کچھ منظر

سکندر بخت بیٹھا ایک خطاواہراں کے سپرد کر رہا تھا۔

